حکمتِ مودودیؒ

جماعتِ اسلامی: حکمتِ عملی اور لائحہ عمل

مرتبہ: خرّم مراد

نصب العین اور منزل

رضائے الٰہی اور اقامتِ دین

مومن کا اصل مقصدِ زندگی رضائے الٰہی کا حصول اور آخرت کی فلاح ہے۔ مگر اس مقصد کا حصول اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ دنیا میں خدا کے دین کو قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس لیے مومن کا عملی نصب العین اقامت دین، اور حقیقی نصب العین وہ رضائے الٰہی ہے جو اقامت دین کی سعی کے نتیجہ میں حاصل ہوگی۔ (دستور جماعتِ اسلامی، ص ۱۶)

ہمہ گیر عالمی انقلاب

یہ بات ہر اس شخص کو جو جماعتِ اسلامی میں آئے اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے، کہ جو اس جماعت کے پیش نظر ہے وہ کوئی ہلکا اور آسان کام نہیں ہے۔ اسے دنیا کے پورے نظامِ زندگی کو بدلنا ہے۔ اسے دنیا کے اخلاق، سیاست، تمدن، معیشت، معاشرت، ہر چیز کو بدل ڈالنا ہے۔ دنیا میں جو نظامِ حیات خدا سے بغاوت پر قائم ہے اسے بدل کر خدا کی اطاعت پر قائم کرنا ہے، اور اس کام میں تمام شیطانی طاقتوں سے اس کی جنگ ہے۔ (روداد اوّل، ص ۱۶، اجتماع اوّل ۱۹۴۱)

ہمارے پیش نظر صرف ایک سیاسی نظام کا قیام نہیں ہے۔ بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ پوری انسانی زندگی ـــــ انفرادی اور اجتماعی ـــــ میں وہ ہمہ گیر انقلاب رونما ہو جو اسلام رونما کرنا چاہتا ہے۔ (روداد سوم، ص ۵۶، تقریر "دعوتِ اسلامی اور اس کا طریق کار" ۱۹۴۵)

انقلابِ امامت

ہماری جدوجہد کا آخری مقصود انقلابِ امامت ہے۔ یعنی دنیا میں ہم جس انتہائی منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ فساق و فجار کی امامت و قیادت ختم ہو کر امامتِ صالحہ کا نظام قائم ہو۔

اور اس سعی و جہد کو ہم رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ (روداد سوم، ص ۲۸، تقریر "تحریکِ اسلامی کی اخلاقی بنیادیں" ۱۹۴۵)

کسی شخص کو اس غلط فہمی میں نہ رہنا چاہیے کہ "سیاست" کوئی عارضہ تھا جو جماعتِ اسلامی کو قیامِ پاکستان کے بعد کسی وقت یکایک لاحق ہوگیا... یہ بات کسی اشتباہ کی گنجائش کے بغیر پوری طرح واضح ہوگئی ہے کہ زمامِ کار کی تبدیلی کو ہمارے نظامِ فکر و عمل میں آغازِ تحریک ہی سے بنیادی اور مرکزی اہمیت حاصل رہی ہے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر میں بلا خوف تردید یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ دراصل یہی وہ امتیازی وصف ہے جو زمانۂ قریب کی تاریخ میں، کم از کم برعظیم ہند کی حد تک، جماعتِ اسلامی کی تحریک کو دوسری تحریکوں سے ممیّز کرتا ہے۔ (تحریکِ اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل، ص ۸۵۔ ۸۶، تقریر اجتماعِ ارکان "ماچھی گوٹھ" ۱۹۵۷)

بنیادی طریقِ کار کے اصول

انبیاء علیہم السلام کا طریقہ

اسلام کا مقصد زندگی کے فاسد نظام کو بالکل بدل دینا ہے۔ یہ کُلّی و اساسی تغیر صرف اسی طریقہ پر ممکن ہے جو انبیاء علیہم السلام نے اختیار کیا تھا۔ (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، سوم، بحوالہ آئندہ لائحہ عمل، ص ۳۷)

اس نصب العین کی طرف پیش قدم کرنے کے لیے راہ راست وہی ہے جو اللہ کے رسولؐ نے اختیار کی۔ یعنی یہ کہ لوگوں کو الہدیٰ اور دینِ حق کی طرف دعوت دی جائے۔ پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کرکے اپنی بندگی و اطاعت اللہ کے لیے خالص کردیں... ان کا ایک مضبوط جتھا بنایا جائے۔ پھر یہ جتھا تمام ان اخلاقی، علمی اور مادی ذرائع سے جو اس کے امکان میں ہوں، دینِ حق کو قائم کرنے کے لیے جہادِ کبیر کرے۔ (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، سوم، بحوالہ آئندہ لائحہ عمل، ص ۳۴، ۳۵)

دستوری طریقِ کار

جدید دستور کی دفعہ ۱۰ (حالیہ دستور کی دفعہ ۵) میں جماعت کا مستقل طریقِ کار یہ بیان کیا گیا ہے

... (۳) جماعت اپنے پیش نظر اصلاح اور انقلاب کے لیے جمہوری اور آئینی طریقوں سے کام

کرے گی، یعنی یہ کہ تبلیغ و تلقین اور اشاعتِ افکار کے ذریعہ سے ذہنوں اور سیرتوں کی اصلاح کی جائے، اور رائے عام کو ان تغیرات کے لیے ہموار کیا جائے جو جماعت کے پیش نظر ہیں۔
(۴) جماعت اپنے نصب العین کے حصول کی جدوجہد خفیہ تحریکوں کے طرز پر نہیں کرے گی، بلکہ کھلم کھلا اور علانیہ کرے گی۔ (آئندہ لائحہ عمل، ص ۵۸۔ ۵۹، اور دستور، ص ۱۶)

مقصد اور تدابیر

اصولی طریقِ کار یہی ہے کہ پہلے ہم اپنی دعوت پیش کریں گے۔ پھر ان لوگوں کو جو ہماری دعوت قبول کریں، منظم کرتے جائیں گے۔ پھر اگر رائے عام کی موافقت سے، یا حالات کی تبدیلی سے، کسی مرحلے پر ایسے آثار پیدا ہو جائیں کہ موجود الوقت دستوری طریقوں ہی سے نظام حکومت کا ہمارے ہاتھوں میں آجانا ممکن ہو، اور ہمیں توقع ہو کہ ہم سوسائٹی کے اخلاقی، تمدنی اور سیاسی و معاشی نظام کو اپنے اصول پر ڈھال سکیں گے، تو ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔ اس لیے کہ ہمیں جو کچھ بھی واسطہ ہے اپنے مقصد سے ہے، نہ کہ کسی خاص طریقے (method) سے۔ لیکن اگر پرامن ذرائع سے جوہرِ اقتدار (substance of power) ملنے کی توقع نہ ہو تو پھر ہم عام دعوت جاری رکھیں گے، اور تمام جائز شرعی ذرائع سے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں گے، (ترجمان القرآن، ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۵، بحوالہ آئندہ لائحہ عمل، ص ۱۰۶)

الیکشن لڑنا اور اسمبلی میں جانا اگر اس غرض کے لیے ہو کہ ایک غیر اسلامی دستور کے تحت ایک لادینی (secular) جمہوری (democratic) ریاست کے نظام کو چلایا جائے تو یہ ہمارے عقیدۂ توحید اور ہمارے دین کے خلاف ہے۔ لیکن اگر کسی وقت ہم ملک کی رائے عام کو اس حد تک اپنے عقیدہ و مسلک سے متفق پائیں کہ ہمیں یہ توقع ہو کہ عظیم اکثریت کی تائید سے ہم ملک کا دستور حکومت تبدیل کر سکیں گے، تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس طریقے سے کام نہ لیں۔ جو چیز لڑے بھڑے بغیر سیدھے طریقے سے حاصل ہو سکتی ہو اس کو خواہ مخواہ ٹیڑھی انگلیوں ہی سے نکالنے کا ہم کو شریعت نے حکم نہیں دیا ہے۔ (ترجمان القرآن، دسمبر ۱۹۴۵، بحوالہ آئندہ لائحہ عمل، ص ۱۰۷)

انفرادی لغزشوں اور کوتاہیوں سے تو بہرحال کوئی جماعت بھی خالی نہیں ہو سکتی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اجتماعی حیثیت سے جماعتِ اسلامی ان اصولوں کی پوری پابندی کرتی رہی ہے۔ . . . تدابیر کا ردّ و بدل ایک دوسری چیز ہے جسے بعض لوگ غلطی سے اصول کا ردّ و بدل قرار دے بیٹھتے

ہیں۔ تدبیروں کا نام اصول نہیں ہے' اور دنیا کی کوئی جماعت بھی ایک تدبیر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پکڑ کر نہیں بیٹھ سکتی۔ خصوصیت کے ساتھ جن لوگوں کو سخت مخالف و مزاحم ماحول میں سے اپنا راستہ نکالنا ہو' ان کے لیے تو یہ ناگزیر بھی ہے' اور دانائی کا تقاضا بھی' کہ اگر ایک وقت انہوں نے ایک تدبیر کو صحیح و مناسب پاکر اختیار کیا ہو' اور دوسرے وقت وہ تدبیر موزوں اور کارگر نہ رہے' تو وہ بلا تامل اس کو کسی بہتر اور حالات کے لحاظ سے مناسب تر تدبیر سے بدل دیں۔

اس ردّ و بدل کو اس وقت تک اصول شکنی سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا جب تک یہ ثابت نہ کردیا جائے کہ جن اصولوں کی پابندی کا ہم نے عہد کیا تھا ان کے حدود اربعہ میں اس ردّ و بدل کی' یا ہماری اختیار کردہ کسی تدبیر کی گنجائش نہ تھی۔ (آئندہ لائحہ عمل' ص ۵۹۔ ۶۰)

اصول اور فروعیات

عام مسلمانوں کے ذہن پر مدتوں کے غلط تصورات کی وجہ سے جزئیات و ظواہر کی اہمیت کچھ اس طرح چھا گئی ہے کہ دین کے اصول و کلیات اور دینداری و اخلاق اسلامی کے حقیقی جوہر کی طرف خواہ کتنی ہی توجہ دلائی جائے' مگر لوگوں کے دماغ پھر پھر کر انہی چھوٹے چھوٹے مسائل اور ذرا ذرا سی ظاہری چیزوں میں اٹک کر رہ جاتے ہیں جنہیں اصل دین بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس وبائے عام کے اثرات خود ہمارے بہت سے رفقاء اور ہمدردوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔

میں اپنا پورا زور یہ سمجھانے میں صرف کرتا رہا ہوں کہ دین کی حقیقت کیا ہے' اور اس میں اصل اہمیت کن چیزوں کی ہے اور اس میں مقدم کیا ہے اور موخر کیا۔ لیکن ان ساری کوششوں کے بعد جب دیکھتا ہوں یہی دیکھتا ہوں کہ وہی ظاہر پرستی اور وہی اصول سے بڑھ کر فروغ کی اہمیت دماغوں پر مسلط ہے۔ آج تین روز سے میرے پاس پرچوں کی بھرمار ہو رہی ہے' جن میں سارا مطالبہ بس اس کا ہے کہ جماعت کے لوگوں کی داڑھیاں بڑھوائی جائیں' پائنچے ٹخنوں سے اونچے کرائے جائیں' اور ایسے ہی دوسرے جزئیات کا اہتمام کرایا جائے۔...

وہ جزئیاتِ شرع جن کو آپ نے دین کے اولین مطالبات میں شمار کر رکھا ہے' تو ان کا حقیقی مقام میں آپ کے سامنے پھر ایک مرتبہ صاف صاف واضح کیے دیتا ہوں تاکہ میں اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاؤں۔

سب سے پہلے ٹھنڈے دل سے اس بات پر غور کیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول دنیا میں کس غرض کے لئے بھیجے ہیں۔ دنیا میں آخر کس چیز کی کمی تھی' کیا خرابی پائی جاتی تھی' جسے رفع

کرنے کے لئے انبیاء کو مبعوث کرنے کی ضرورت پیش آئی ؟ کیا وہ یہ تھی کہ لوگ داڑھیاں نہ رکھتے تھے اور انہیں رکھوانے کے لیے رسول بھیجے گئے ' یا یہ کہ لوگ ٹخنے ڈھانکے رہتے تھے اور انبیاء کے ذریعے سے انہیں کھلوانا مقصود تھا ؟ یا وہ چند سنتیں جن کے اہتمام کا آپ لوگوں میں بہت چرچا ہے ' دنیا میں جاری نہ تھیں اور انہی کو جاری کرنے کے لیۓ انبیاء کی ضرورت تھی ؟ ان سوالات پر آپ غور کریں گے تو خود ہی کہہ دیں گے کہ نہ اصل خرابیاں یہ تھیں اور نہ انبیاء کی بعثت کا اصل مقصود یہ تھا۔ (روداد' سوم ' ص ۲۵۲ - ۲۵۳)

خوب اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ جن جزئیات پر آپ لوگ بحثیں کرتے ہیں' وہ خواہ کتنی ہی اہمیت رکھتی ہوں مگر ' بہرحال یہ وہ چیزیں نہیں ہیں جن کو قائم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو مبعوث کیا ہو اور اپنی کتابوں کو نازل کیا ہو ۔ انبیاء کی بعثت اور کتبِ الٰہی کی تنزیل کا مقصد ان جزئیات کو قائم کرنا نہیں ہے ۔

ان کا اصل مقصد یہ رہا ہے کہ خلقِ خدا اپنے مالکِ حقیقی کے سوا کسی کے تابع فرمان نہ رہے' قانون صرف خدا کا قانون ہو ' تقویٰ صرف خدا سے ہو ' امر صرف خدا کا مانا جائے ' حق اور باطل کا فرق اور زندگی میں راہِ راست کی ہدایت صرف وہی مسلّم ہو جسے خدا نے واضح کیا ہے ' اور دنیا میں ان خرابیوں کا استیصال کیا جائے جو اللہ کو ناپسند ہیں' اور ان خیرات و حسنات کو قائم کیا جائے جو اللہ کو محبوب ہیں ۔

یہ ہے دین ' اور اسی کی اقامت ہمارا مقصد ہے ' اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے اسی کام پر ہم مامور ہیں ۔ اس کام کی اہمیت اگر آپ پوری طرح محسوس کرلیں' اور اگر آپ کو اس بات کا بھی احساس ہو کہ اس کام کے معطل ہوجانے اور باطل نظاموں کے دنیا پر غالب ہوجانے سے دنیا کی موجودہ حالت کس قدر شدت سے غضبِ الٰہی کی مستحق ہوچکی ہے' اور اگر آپ یہ بھی جان لیں کہ اس حالت میں ہمارے لیۓ غضبِ الٰہی سے بچنے اور رضائے الٰہی سے سرفراز ہونے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ ہم اپنی تمام قوت' خواہ وہ مال کی ہو یا جان کی ' دماغ کی ہو یا زبان کی ' صرف اقامت دین کی سعی میں صرف کردیں ' تو آپ سے کبھی ان فضول بحثوں اور ان لایعنی افکار کا صدور نہ ہوسکے جن میں اب تک آپ میں سے بہت سے لوگ مشغول ہیں ۔ میرے نزدیک یہ تمام مشاغل صرف اس ایک چیز کا نتیجہ ہیں کہ لوگوں نے ابھی تک اس بات کو پوری طرح سمجھا نہیں ہے کہ دین حقیقت میں کس چیز کا نام ہے' اور اس کے واقعی مطالبات اپنے پیروؤں سے کیا ہیں ۔(روداد سوم ' ص ۸۹ - ۹۰)

قیامِ پاکستان سے قبل حکمتِ عملی

تعلیم و تحقیق

ہمارے پیش نظر ایسے علماء اور ماہرین کا پیدا کرنا ہوگا جو زندگی کے مختلف شعبوں میں قیادت و رہنمائی کے اہل ہوں، جن میں یہ قابلیت ہو کہ اسلام کے اصولوں پر ایک پورے نظامِ تمدن کو تعمیر کرسکیں اور ایک جدید ترین اسٹیٹ کی تنظیم کا بار اٹھا سکیں۔ اس کے لیے جس علم، جس قوت اجتہاد، اور جس متقیانہ سیرت کی ضرورت ہے وہ ان میں تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے پیدا کی جائے گی۔ (روداد، اول، ص ۶۵)

اگر ہمیں واقعی نظامِ تمدن و اخلاق میں کوئی انقلاب برپا کرنا ہے تو ہمارے لیے ناگزیر ہے کہ۔ . . ایسا لٹریچر فراہم کریں جو اسلامی نظام کی پوری شکل و صورت سے دنیا کو آشنا کرے، اور اپنی تنقید سے موجودہ تہذیب و تمدن کی جڑیں اکھاڑ کر دلوں اور دماغوں میں نظامِ اسلامی کی صداقت کا یقین اور اس کے قیام کی خواہش پیدا کردے۔ نیز ہمیں قرآن، حدیث، فقہ اور تاریخ اسلام کے متعلق جملہ علوم کی تدوین جدید کرنی ہوگی، اور اسی طرح علومِ جدیدہ کو بھی اسلامی نقطۂ نظر سے از سرِ نو مدوّن کرنا ہوگا۔ یہ کام کیے بغیر ہم ہرگز یہ توقع نہیں کرسکتے کہ مجرّد کسی عمومی یا عسکری تحریک سے کوئی حقیقی اسلامی انقلاب دنیا کے موجودہ نظامِ تمدن و اخلاق میں رونما ہو جائے گا۔ (روداد، اوّل، ص ۶۵۔ ۶۶)

رائے عام

تعمیری کاموں کے ساتھ ہم دعوتِ عام کا کام بھی پوری قوت کے ساتھ چلانا چاہتے ہیں۔ ہماری تعمیری کوششیں بے سود ہوجائیں گی اگر ساتھ ساتھ ان کی پشت پر ایک مضبوط رائے عام بھی تیار نہ ہوتی رہے۔ جس طرح . . . تعمیری کاموں کے بغیر کوئی اسلامی انقلاب رونما نہیں ہوسکتا، اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ عامہ الناس میں اسلام کی دعوت پھیلائے بغیر ایسا کوئی انقلاب برپا ہوسکے۔

ہمیں نہ صرف ہندوستان میں، بلکہ حتی الامکان دنیا کے گوشے گوشے میں، اپنی آواز پہنچانی ہوگی، کیونکہ آج کسی ایک ملک میں کوئی حقیقی انقلاب واقع نہیں ہوسکتا جب تک کہ وسیع پیمانہ پر بین الاقوامی رائے عام اس کی تائید میں تیار نہ کرلی جائے۔ اربوں انسانوں کو ہمارے پیغام سے واقف ہونا چاہیے، کروڑوں انسانوں کو کم از کم اس حد تک اس سے متاثر ہو جانا چاہیے کہ اس

چیز کو حق مان لیں جس کے لیے ہم اٹھ رہے ہیں' لاکھوں انسانوں کو ہماری پشت پر اخلاقی اور عملی تائید کے لیے آمادہ ہونا چاہیے' اور ایک کثیر تعداد ایسے سرفروشوں کی تیار ہونی چاہیے جو بلند ترین اخلاق کے حامل ہوں اور اس مقصد عظیم کے لیے کوئی خطرہ' کوئی نقصان' کوئی مصیبت برداشت کرنے میں تامل نہ کریں۔ (روداد' اوّل' ص ٦٦۔ ٦٧)

عوامی مظاہر

تحریکِ اسلامی اپنا ایک خاص مزاج رکھتی ہے اور اس کا ایک مخصوص طریقہ کار ہے جس کے ساتھ دوسری تحریکوں کے طریقے کسی طرح جوڑ نہیں کھاتے . . . جلسے اور جلوس' جھنڈے اور نعرے' یونیفارم اور مظاہرے' ریزولیوشن اور ایڈریس' بے لگام تقریریں اور گرما گرم تحریریں' اور اس نوعیت کی تمام چیزیں ان تحریکوں کی جان ہیں مگر اس تحریک کے لیے سمِّ قاتل ہیں۔

عوامی بہاؤ

آپ کو زبان یا قلم یا مظاہروں سے عوام پر سحر نہیں کرنا ہے کہ ان کے ریوڑ کے ریوڑ آپ کے پاس آجائیں اور آپ انہیں ہانکتے پھریں۔

عوامی تحریک اور صالح جماعت

ہمیں عوام میں ایک عمومی تحریک (mass movement) چلانے سے پہلے ایسے آدمیوں کو تیار کرنے کی فکر کرنی ہے جو بہترین اسلامی سیرت کے حامل ہوں' اور ایسی اعلیٰ درجے کی دماغی صلاحیتیں بھی رکھتے ہوں کہ تعمیر افکار کے ساتھ اجتماعی قیادت کے دہرے فرائض کو سنبھال سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں عوام میں تحریک کو پھیلا دینے کے لیے جلدی نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ میری تمام تر کوشش اس وقت یہ ہے کہ ملک کے اہلِ دماغ طبقوں کو متاثر کیا جائے' اور ان کو کنگال کر صالح ترین افراد کو چھانٹ لیا جائے جو آگے چل کر عوام کے لیڈر بھی بن سکیں اور تہذیبی و تمدنی معمار بھی۔ . . .

یہ اعتراض بجا ہے کہ کثیر التعداد عوام کو اس نقشے کے مطابق بلند سیرت بنانے کے لیے مدتِ مدید درکار ہے۔ مگر ہم اپنے انقلابی پروگرام کو عوام کی اصلاح ہوچکنے کے انتظار میں ملتوی کرنا نہیں چاہتے۔ ہمارے پیشِ نظر صرف یہ نقشہ ہے کہ عوام کی سربراہ کاری کے لیے ایک ایسی مختصر جماعت فراہم کرلی جائے جس کا ایک ایک فرد اپنے بلند کیرکٹر کی جاذبیت سے ایک ایک علاقے کے عوام کو سنبھال سکے۔ اس کی ذات عوام کا مرجع بن جائے اور بالکل فطری طریقے سے عوام کی لیڈر

شپ کا منصب اسے حاصل ہوجائے۔ مگر صرف مرجعیت سے بھی کام نہیں چلتا۔ اس سے کام لینے کے لیے دماغی صلاحیتیں بھی ہونی چاہئیں تاکہ ان کی مرکزی شخصیتوں کے ذریعہ سے عوام کی قوتیں مجتمع اور منظّم ہو کر اسلامی انقلاب کی راہ میں صَرف ہوں۔ (روداد، اوّل، بحوالہ آئندہ لائحہ عمل ص ۱۰۸ - ۱۰۹)

قیامِ پاکستان کے بعد حکمت عملی میں تغیرات

لٹریچر اور حالات کا سیاق و سباق

آج بعض لوگ حالات کے سیاق و سباق کو نظر انداز کر کے ... بعض اقتباسات پیش کر کے ان سے چند بالکل غلط نتائج نکال رہے ہیں ... یہ ... مضامین جن کا وہ حوالہ دیتے ہیں، ۱۹۴۰ کے لکھے ہوئے ہیں ۔اس وقت بحث یہ نہیں تھی کہ مسلمانوں کی لادینی قومی جمہوری ریاست تو وجود میں آگئی ہے، اب اسے اسلامی ریاست و حکومت میں تبدیل کیسے کیا جائے۔ بلکہ یہ بحث تھی کہ ہم دارا لکفر میں رہتے ہوئے ایک اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنے کی جدّوجہد کا آغاز کس طرح کریں (آئندہ لائحہ عمل، ص ۱۱۰۔ ۱۱۱)

جو لوگ اس تحریک کے درمیانی مراحل میں آئے ہیں، یا آئندہ آئیں گے وہ اسے صرف اس کے لٹریچر سے سمجھنے کی کوشش کریں گے، اور ان کے سامنے وہ حالات نہ ہوں گے جن میں مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے یہ لٹریچر پیدا ہوتا رہا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ کسی خاص دور کی لکھی ہوئی کسی عبارت سے کوئی شخص الٹے معنی برآمد کر بیٹھے اور الجھنوں میں مبتلا ہوجائے۔ حالانکہ ایک تحریک کے لٹریچر کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر دور میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو پڑھتے ہوئے وہ حالات بھی آدمی نگاہ میں ہوں جن میں وہ لکھا گیا تھا۔ (آئندہ لائحہ عمل، ص ۸۴)

طریقِ کار اور حالات میں تغیر

جن حالات میں ہم نے اقامتِ دین کی جدّوجہد کے لیے مطالبہ دستورِ اسلامی کو نقطۂ آغاز کی حیثیت سے منتخب کیا تھا ان میں پیش قدمی کا یہی ایک راستہ صحیح تھا۔ فطری طریقِ انقلاب، کا یہ تصور کہ وہ کوئی ایسا لگا بندھا طریقہ ہے جو ہر جگہ ہر طرح کے حالات میں ایک ہی ڈھنگ پر چلنا چاہیے، سراسر ایک غیر معقول تصور ہے۔ ایک نئی نئی آزاد ہونے والی مسلمان قوم کے اندر

انقلاب لانے کا فطری اور معقول راستہ وہ نہ تھا جس پر قبل تقسیم کے حالات میں ہم کام کر رہے تھے۔ (آئندہ لائحہ عمل، ص ۱۵۸)

اب مجھے ... آپ کو یہ بتانا ہے کہ تقسیم کے موقع پر اور اس کے فوراً بعد حالات میں کتنا عظیم اور بڑی حد تک غیر متوقع تغیر واقع ہوگیا' ان بدلے ہوئے حالات کے تقاضے قبل تقسیم کے حالات سے کس قدر مختلف تھے' اسلامی تحریک کے نقطۂ نظر سے ان کے موافق اور مخالف پہلو کیا تھے' ان میں کام کرنے کے لیے کیا نئے مواقع ہمارے سامنے آئے اور کیا نئے ذرائع ہمیں بہم پہنچے' تقسیم سے پہلے ہمارے لیے آئینی ذرائع سے نظام حکومت کو بدلنے اور قیادت میں انقلاب لانے کے جو دروازے شرعی موانع کی وجہ سے بالکل بند تھے انہیں کھولنے کے کیا نئے امکانات پیدا ہوگئے' اور اس پوری صورت حال کا بروقت اور بالکل ٹھیک اندازہ کرکے ہم نے اپنے سابق طریق کار میں جو تغیر کیا اس کی حقیقی نوعیت کیا تھی اور وہ کیوں نہ صرف صحیح اور نہ صرف ناگزیر تھا بلکہ اگر ہم ان حالات میں قبل تقسیم کے طریقے ہی پر کام کرتے رہتے تو اپنے مقصد کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا دیتے... (آئندہ لائحہ عمل، ص ۱۲۰ - ۱۲۱)

با اختیار مسلم عوام میں کام کے تقاضے

اس تغیر عظیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان کے نظامِ زندگی کی شکل کا تعین بالکل مسلمانوں کی رائے عام پر منحصر ہوگیا' در آں حالیکہ متحدہ ہندوستان میں وہ غیر مسلموں کی رائے پر منحصر تھا۔ اور اس فرق عظیم کے واقع ہوجانے کے بعد یہ ضروری ہوگیا کہ ہم اسلامی نظام زندگی کے لیے اس غالب مسلم آبادی کے ملک میں کام کرنے کا ڈھنگ اس ڈھنگ سے مختلف اختیار کریں جو ہم کو غالب غیر مسلم آبادی کے ملک میں اس کام کے لیے اختیار کرنا پڑ رہا تھا۔

اگرچہ مسلمانوں کی اعتقادی اور اخلاقی کمزوری کو نظر انداز کرکے محض "مسلمان" ہونے کے مفروضے پر ایک عمارت کھڑی کر دینا بڑی حماقت ہے' لیکن اس سے کچھ کم درجے کی حماقت یہ بھی نہیں ہے کہ اسلام کے لیے ان کی عقیدت' اور اس کے ساتھ ان کی جذباتی وابستگی' اور اس کی طرف ان کے فطری میلان و رجحان کو نظر انداز کرکے آدمی ان کے درمیان اس طرح کام کرنے لگے جس طرح کسی منکر اسلام یا مخالف اسلام آبادی میں کیا جاتا ہے۔

کسی ملک میں ایک غالب مسلم آبادی کی موجودگی اسلامی نظام کے حق میں رائے عام تیار کرنے کے جو مواقع بہم پہنچاتی ہے ان سے فائدہ نہ اٹھانا اور زمامِ کار کی تبدیلی کے لیے جدّوجہد کے جو راستے اس میں کھل سکتے ہیں انہیں بند سمجھ لینا کسی صاحب عقل آدمی کا کام نہیں ہوسکتا۔

(آئندہ لائحہ عمل، ص ۱۲۳)

وقت کا چیلنج

صاف معلوم ہوگیا [تھا] کہ اس وقت ایک بے شعور قوم کی باگیں ایک بے فکرے گروہ کے ہاتھ میں ہیں، یہ وقت خاموش بیٹھ کر تعمیری کام میں لگے رہنے کا نہیں ہے۔...

ہمارے سامنے کام کا جو نقشہ تھا اس کے لحاظ سے ہم کسی عوامی تحریک کے آغاز سے پہلے یہ چاہتے تھے کہ ہمارے پاس ایسے کارکنوں کا ایک گروہ موجود ہو جو نظم و ضبط کے اعتبار سے خوب پختہ اور سیرت و اخلاق کے اعتبار سے پوری طرح قابلِ اعتماد ہوں، ذہنی صلاحیتوں کے اعتبار سے ہر میدان میں مخالف نظریات و افکار کو شکست دینے اور ایک نیا نظام تعمیر کرنے کے لائق ہوں، اور ان میں قیادت کی صلاحیتیں بھی اس حد تک پائی جاتی ہوں کہ ان میں کا ایک ایک آدمی ایک ایک علاقے کا لیڈر بن سکے اور عوام کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق باقاعدگی کے ساتھ ابھار سکے اور منظم طریقے سے ساتھ لے کر چل سکے۔

ان اعتبارات سے ہم ابھی اپنے اندر بہت کچھ کمی محسوس کرتے تھے اور اپنی جماعت کو تیار کرنے کے لیے مزید وقت کے طالب تھے۔ لیکن ہمارے سامنے اس وقت اصل سوال یہ نہیں تھا کہ ہم اس کمی کو پورا کریں یا نہ کریں، بلکہ اصل سوال یہ تھا کہ آیا ہم جماعتی حیثیت سے اس وقت حالات کے اس چیلنج کا جواب دینے کے قابل ہیں یا نہیں؟

دوسرے الفاظ میں اس وقت ہمارے سامنے معاملے کی نوعیت یہ نہ تھی کہ کام کے جو مواقع، اور راہ کی رکاوٹیں دور کرنے کے جو امکانات، اور مخالف حالات کی وجہ سے جو خطرات، ہمارے لیے آج پیدا ہوئے ہیں، وہ سب اس انتظار میں ٹھہرنے کے لیے تیار ہیں کہ ہم اپنی تیاریوں کی تکمیل کرکے میدان میں آئیں۔ بلکہ وقت یہ صورت حال لے کر ہمارے سامنے آیا تھا کہ ہر موقع ہاتھ سے جانے کے لیے اور ہر امکان ختم ہونے کے لیے اور ہر خطرہ واقع ہوجانے کے لیے پر تولے کھڑا ہے۔ لہٰذا اس وقت ہمیں فوراً اور بروقت یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آیا ہم فی الحقیقت اس درجہ کمزور اور ناقابلِ کار ہیں کہ پیش آمدہ مواقع اور امکانات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے، اور ان خطرات کو روکنے کے لیے بھی کچھ نہیں کرسکتے جو علانیہ آتے نظر آ رہے ہیں؟ اور اگر حقیقتاً ہماری طاقت ایسی گئی گزری نہیں ہے بلکہ سوال صرف مزید تکمیل کی سعی کا ہے، تو آیا ہمارے مقصد کے لیے یہ زیادہ مفید ہے کہ ہم اس تکمیل کی سعی میں لگے رہیں، اور تمام مواقع کھو دیں، سارے امکانات ضائع کردیں، ہر ممکن خطرے کو نازل ہوجانے دیں؟ یا یہ زیادہ بہتر ہے

کہ جتنی اور جیسی کچھ طاقت بھی اللہ نے ہمیں بخشی ہے اسے لے کر کام کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں' اور تکمیل کی مساعی جہاں تک بھی ممکن ہو اس کے ساتھ ساتھ کرتے رہیں۔
(آئندہ لائحہ عمل' ص ۱۳۶ - ۱۳۸)

طریقِ کار میں تبدیلی اور اس کی حقیقی نوعیت

حالات کا جائزہ لینے اور اپنی طاقت اور ذرائع کا اندازہ کرنے کے بعد ہم نے اسلامی نظام کے مطالبے سے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا۔ اور یوں ہماری تحریک نے ایک نئے دور میں قدم رکھا۔ . . .

جس بات کے سمجھنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ وہ کیا تغیر تھا جو اس دور میں ہم نے اپنے سابق طریقِ کار میں کیا' اور اس کی حقیقی نوعیت کیا تھی' اور نئے حالات میں اس خاص نوعیت کا تغیر کیوں مناسب ترین تھا۔

تقسیم سے پہلے جس طریق کار پر ہم کام کر رہے تھے اس کی عملی صورتوں سے قطع نظر' اصولاً وہ اس نقشے پر مبنی تھا : ایک ایسی تحریک اٹھائی جائے جو اپنے بنیادی نظریے' اپنے مزاج' اپنی قیادت اور اپنے کارکنوں کی سیرت کے اعتبار سے صحیح معنوں میں اسلامی ہو۔ یہ تحریک ایک طرف معاشرے کی ذہنیت اور اس کی اخلاقی روح کو اسلام کے مطابق بدلنے کی کوشش کرے' دوسری طرف ایسے اصحابِ فکر تیار کرے جو نظامِ باطل کی نظری بنیادوں کو توڑنے اور نظامِ حق کی بنیاد پر نئی عمارت اٹھانے کی صلاحیت رکھتے ہوں' اور تیسری طرف نظامِ باطل کے خلاف عملاً کشمکش برپا کرکے اسے پیچھے دھکیلنے اور خود آگے بڑھنے کی سعی کرتی چلی جائے' یہاں تک کہ ان تین راستوں سے ایک ساتھ پیش قدمی کرتے ہوئے وہ منزل آ پہنچے جب معاشرے کی بدلی ہوئی آب و ہوا میں نظامِ باطل کا چلنا مشکل ہوجائے' نظامِ حق کے لیے جگہ چھوڑ دینے پر وہ مجبور ہو' اور اس نئے نظام کو سنبھالنے کے لیے موزوں آدمی بھی تیار پائے جائیں۔ . . .

تقسیم کے بعد اس اصولی طریقِ کار میں درحقیقت کوئی بنیادی تغیر نہیں کیا گیا۔ ہماری تحریک کی اساس وہی رہی جو پہلے تھی۔ معاشرے کی ذہنیت اور اس کی اخلاقی روح کو بدلنا اسی طرح ہمارے پروگرام کا ایک لازمی جزو رہا جس طرح پہلے تھا۔ اصحابِ فکر کی تیاری کے لیے بھی ہم انہی دو راستوں سے کام کرتے رہے جن سے پہلے کام کر رہے تھے۔ اور نظامِ باطل کے خلاف کشمکش جس کا اب ہم نے آغاز کیا وہ بھی نئی چیز نہ تھی بلکہ پہلے سے ہمارے طریقِ کار میں شامل تھی۔

اب جس چیز کو تغیر کہا جاسکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہم نے حالات کی تبدیلی کے ساتھ اس طریقِ کار پر عمل درآمد کی شکل تبدیل کردی۔ (آئندہ لائحہ عمل' ص ۱۴۰- ۱۴۳)

اپیل کے طریقے میں تبدیلی

پہلی تبدیلی ہم نے اپنے اپیل کے طریقے میں کی' کیونکہ اب ہم ایک ایسے ملک میں کام کر رہے تھے جس کی غالب آبادی' قریب قریب ۹۰ فی صد' مسلمانوں پر مشتمل تھی' اور جس میں نظام زندگی کے بننے اور بگڑنے کا انحصار مسلمانوں ہی کی عام خواہش پر تھا' ظاہر ہے کہ یہاں اپیل کا بعینہٖ وہ طریقہ موزوں نہ ہوسکتا تھا جو غالب غیر مسلم آبادی کے ملک میں اختیار کیا جا رہا تھا۔ (آئندہ لائحہ عمل' ص ۱۴۳)

کام کے ڈھنگ میں تبدیلی

دوسری تبدیلی ہم نے اپنے کام کے ڈھنگ میں کی۔ پہلے ہم مواقع کے فقدان کی وجہ سے دعوت' توسیع نظام جماعت' اور اصلاح معاشرہ کا کام صرف چند متعین طریقوں سے بہت محدود پیمانے پر کر رہے تھے۔ اب مواقع بہم پہنچتے ہی ہم نے یہ تینوں کام وسیع پیمانے پر کرنے شروع کردیے' اور مطالبہ نظام اسلامی کی جدوجہد کو ان کا وسیلہ بنایا۔ اس جدوجہد نے ہمارے لیے یہ راستہ کھول دیا کہ لاکھوں آدمیوں تک اپنی دعوت پہنچائیں' ان میں سے ہزاروں کو اپنی تحریک کے ساتھ رکن یا متفق یا ہمدرد و متاثر کی حیثیت سے وابستہ کرلیں' اور معاشرے میں اسلامی نظام کی حمایت اور اس کی طلب کا عام جذبہ پیدا کرتے چلے جائیں' جس کا لازمی نتیجہ غیر اسلامی قدروں کے مقابلے میں اسلامی قدروں کا فروغ ہے۔

لیکن اس تبدیلی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ پہلے طریقے کو ہم نے بالکل ترک کرکے صرف اس دوسرے طریقے ہی پر اعتماد کرلیا۔ اس توسیعی کوشش کے ساتھ ہم اپنے سابق طریقے کے مطابق استحکام کی سعی بھی کرتے رہے ہیں اور اس کی اہمیت و ضرورت ہماری نگاہ میں علیٰ حالہٖ قائم ہے۔

البتہ جن نئے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ہم کو تقسیم کے بعد اٹھنا پڑا تھا ان سے عہدہ برآ ہونا اس مستحکم توسیع کے ذریعہ سے ممکن نہ تھا جو دھیمی رفتار سے محدود پیمانے پر ہی ہوسکتی ہے۔ اور یہ بات صحیح بھی نہ تھی کہ بڑے پیمانے پر توسیع کے جو مواقع ہمیں حاصل ہوئے تھے ان کو ہم چھوڑ دیتے' اور بجائے خود اس توسیع کے جو فوائد ہیں ان کو نظرانداز کردیتے۔ (آئندہ لائحہ عمل' ص ۱۴۳ - ۱۴۴)

پیش قدمی کی رفتار میں تبدیلی

تیسری تبدیلی ہم نے اپنی پیش قدمی کی رفتار میں کی۔ پہلے جس اسکیم پر ہم کام کر رہے تھے

اس میں نظامِ باطل کی کار فرما طاقتوں سے براہ راست کشمکش کا مرحلہ بہت دیر میں آنا تھا' اور اس مرحلے میں بھی ہم کو آہستگی کے ساتھ بتدریج داخل ہونا تھا۔ خود ہماری جماعتی مشینری بھی اس سکیم کے لحاظ سے کشمکش کے تدریجی ارتقاء ہی کے لیے تیار ہوئی تھی۔ لیکن نئے حالات سے سابقہ پیش آتے ہی ہم نے دفعتہً جدوجہد کے مرحلے میں قدم رکھ دیا' اور یہ جدوجہد بھی آہستگی کے ساتھ بتدریج بڑھنے والی نہ تھی' بلکہ یک لخت ملک گیر ہوجانے والی اور مختلف محاذوں پر پھیل جانے والی تھی۔

ہمارا اندازہ تھا' اور الحمدللہ کہ ہم اپنے اس اندازے میں غلط ثابت نہ ہوئے کہ ہماری جماعتی مشینری اس اچانک تبدیلی کو سہار لے جائے گی۔ دراصل وقت کی نزاکت کو سامنے رکھ کر اپنے مقصدِ عظیم کی خاطر ہم نے یہ ایک بڑا خطرہ محض اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر مول لیا تھا۔ اس میں اس امر کا پورا امکان تھا کہ ہمارا اندازہ غلط ثابت ہو'... لیکن جس خدا کے بھروسے پر ہم نے یہ خطرہ مول لیا تھا اس نے ہماری مدد فرمائی اور ضائع ہونے کے بجائے محض اس کے فضل سے یہ اتنی ہی قوت اور وسعت پکڑتی چلی گئی جتنا اس پر کام کا بار بڑھتا چلا گیا۔ (آئندہ لائحہ عمل' ص ۱۴۴ - ۱۴۵)

پیش قدمی کے نقشے میں تبدیلی

چوتھی اور بڑی اہم تبدیلی' جسے دراصل تبدیلی کے بجائے اجتہاد کہنا زیادہ صحیح ہے' ہم نے اپنی پیش قدم کے نقشے میں کی۔ اس کو میں تبدیلی کے بجائے اجتہاد کہنا اس لیے صحیح سمجھتا ہوں کہ ہمارے پاس ایسی کوئی اسکیم پہلے سے بنی ہوئی نہ تھی ' اور ہو بھی نہیں سکتی تھی کہ نظامِ باطل کے خلاف ہماری کشمکش کا نقطۂ آغاز کیا ہوگا' پھر اس سے کشمکش کرتے ہوئے ہم کس راستے سے' یا کن کن راستوں سے اقامتِ حق کی جدّوجہد میں پیش قدمی کریں گے' اور اس پیش قدمی کے دوران میں مزاحم طاقتوں کو روکنے اور پیچھے ہٹانے کے لیے ہمیں کیا کچھ کرنا ہوگا۔

یہ سب کچھ بہرحال حالات پر منحصر تھا۔ کوئی بھی اس کے لیے پیشگی مفصّل نقشہ نہ بنا سکتا تھا اور نہ تمام حالات میں ایسے کسی نقشے پر لگی بندھی جدّوجہد کی جاسکتی تھی... ہم نے وقت کے تقاضوں کو سمجھ کر ٹھیک موقع پر یہ رائے قائم کی کہ کشمکش کا آغاز کرنے کے لیے اسلامی دستور کے مطالبہ سے زیادہ موزوں کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔ (آئندہ لائحہ عمل' ص ۱۴۵ - ۱۴۶)

تبدیلی کی ضرورت

اب یہ بات آخر آپ میں سے کس سے چھپی ہوئی ہے کہ ۴۰ء سے ۴۷ء تک پہنچتے پہنچتے

واقعات کی دنیا کس قدر بدل گئی ؟ . . .

بے شک میں نے ۱۹۴۰ء میں اسلامی حکومت قائم کرنے کے لیے ایک طریق کار پیش کیا تھا' مگر کیا یہ کوئی عقل مندی ہوتی کہ ۴۷ء تک پہنچتے پہنچتے حالات میں جو عظیم تغیر رونما ہوگیا تھا اس کا ہم کوئی نوٹس نہ لیتے اور بدلے ہوئے حالات کو سمجھ کر اپنے ابتدائی طریق کار میں کوئی رد و بدل نہ کرتے ؟ بیشک میں نے اس طریقِ کار کو انبیاء کا طریقہ کہا تھا' اور آج بھی کہتا ہوں' مگر کسی صاحبِ عقل آدمی سے میں یہ توقع نہیں رکھتا کہ وہ ایک طریقِ کار کے بنیادی اصولوں اور حالات پر ان کے عملی انطباق کی مختلف اشکال کے درمیان فرق نہ کرے گا۔ اس طریقِ کار کے بنیادی اصول ہم نے کبھی نہیں بدلے' نہ انہیں بدلنے کے ہم قائل ہیں۔ لیکن جو شخص حالات اور مواقع اور ذرائع کی تبدیلی کے ساتھ ان اصولوں پر عمل در آمد کی شکلیں نہ بدل سکے اس کی مثال میرے نزدیک اس عطائی طبیب کی سی ہے جو کسی حکیم کی بیاض کا ایک نسخہ لے کر بیٹھ جائے اور آنکھیں بند کرکے تمام مریضوں پر اسے جوں کا توں استعمال کرتا چلا جائے۔ (آئندہ لائحہ عمل ص ۱۱۵ - ۱۱۷)

توسیع و استحکام' دعوت عام' اور دین و سیاست

توسیع سے گھبرانے کی ضرورت نہیں' ہونے دیجیے

تحریکوں میں ایک چیز ہوتی ہے [توسیع] extension اور دوسری چیز [استحکام] consolidation۔ اگر ان دونوں چیزوں کے درمیان توازن باقی نہ رہے تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ توسیع زیادہ تیز رفتار سے ہوتی جاتی ہے جبکہ اسے مستحکم بنانے کے کام میں کمی آتی جاتی ہے۔ اس معاملے میں یہ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ یہ ایک فطری بات ہے۔ جتنا آپ کا کام بڑھے گا' آپ کی استحکامی قوت کی بہ نسبت توسیع کا کام زیادہ ہوگا۔

مثال کے طور پر آپ دیکھیے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ابتدائی تیرہ سال میں چند سو آدمی آپ کے ساتھ آئے۔ اس کے بعد چار پانچ سال کی مدت میں زیادہ سے زیادہ چند ہزار آدمی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ لیکن جس وقت مکہ فتح ہوا اور حنین میں کفر و شرک کی زبردست قوت کو شکست دے دی گئی تو' جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے' . . . لوگ فوج در فوج آکر اللہ کے دین میں داخل ہوتے چلے گئے۔ . . .

ایک بڑی کثیر تعداد ان میں ایسی تھی جو دین کو پوری طرح سمجھ کر نہیں آئی تھی اور نہ دینی

اخلاق کو اپنے اندر جذب کر سکی تھی۔ دین کی روح ان کے اندر اچھی طرح پیدا نہیں ہو سکی تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد یک لخت ارتداد کا دور شروع ہو گیا۔

اب دیکھیے کہ وہ کیا چیز تھی جس نے اس ارتداد کے طوفان کو پھیر دیا اور عرب کو پھر اسلام پر مضبوطی کے ساتھ جما دیا۔ وہ یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو Nucleus چھوڑ گئے تھے وہ اتنا زبردست تھا کہ اس نے اتنے بڑے ارتداد کو کچل کر رکھ دیا۔

اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر extension (توسیع) زیادہ بڑے پیمانے پر ہو جائے تو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ consolidation (استحکام) اگر پوری طرح سے نہ ہو سکے تو اس سے بھی گھبرانے کی ضرورت نہیں ۔ اصل چیز یہ ہے کہ تحریک کا نیوکلیئس اتنا مضبوط ہو کہ وہ اپنے گرد ایک بڑا ہالہ جمع کر لے اور یہ ہالہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہے۔ اور اگر وہ اس سے ہٹے تو وہ نیوکلیئس اور طاقتوں کو کھینچ کر اپنے ساتھ ملا لے۔ . . .

توسیع کتنی بھی ہوتی چلی جائے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ توسیع کو روکنے کی بھی ضرورت نہیں۔ توسیع ہونے دیجیے' لیکن نیوکلیئس مضبوط بناتے چلے جایئے۔ یہ چیز انشاء اللہ آپ کو اس پریشانی سے نکال دے گی کہ رفتارِ کار سست ہوتی جا رہی ہے یا کمزوریاں پیدا ہو رہی ہیں۔ (تصریحات' ص ۳۹۰ - ۳۹۲)

توسیع اور استحکام کے درمیان توازن

توسیع اور استحکام کے درمیان توازن و تناسب ذہنی دنیا میں تو قائم کیا جاسکتا ہے' مگر عملی دنیا میں یہ ممکن نہیں ہے۔ ایک شخص اگر آپ کے پاس شرک یا کفر سے توبہ کرنے کے لیے آئے' تو آخر کس عذر کی بنا پر آپ اسے الٹا واپس کردیں گے ؟ کیا آپ اس سے یہ کہیں گے کہ اس وقت میں استحکام میں مصروف ہوں' اور توسیع کا کام میں نے فی الحال بند کر رکھا ہے ؟ (ترجمان القرآن' دسمبر ۱۹۵۳' بحوالہ رسائل و مسائل' چہارم' ص ۲۹۰)

ہمارا کام' ہر انسان کے لیے

اسلام تمام انسانوں کے لیے ہے' اور ہر چیز جس کا انسان سے کوئی تعلق ہے اس کا اسلام سے بھی تعلق ہے' لہٰذا اسلامی تحریک ایک ہمہ گیر نوعیت کی تحریک ہے اور یہ خیال کرنا غلط ہے کہ اس تحریک میں کام کرنے کے لیے صرف خاص قابلیتوں اور خاص علمی معیار کے آدمیوں ہی کی ضرورت ہے' نہیں' یہاں ہر انسان کے لیے کام موجود ہے' کوئی انسان بیکار نہیں ہے' جو شخص

جو قابلیت بھی رکھتا ہو اس کے لحاظ سے وہ اسلام کی خدمت میں اپنا حصہ ادا کرسکتا ہے۔ عورت' مرد' بوڑھا' جوان' دیہاتی' شہری' کسان' مزدور' تاجر' ملازم' مقرر' محرر' ادیب' ان پڑھ اور فاضل اجل' سب یکساں مفید ہوسکتے ہیں۔ (روداد' اوّل' ص ۱۵ - ۱۶)

تبلیغ کے ساتھ' اصلاح خلق اور خدمت خلق

آپ کے سامنے ایک کام تو یہ ہے کہ تعلیم یافتہ طبقے میں اپنے ہم خیالوں کی تعداد اسی طرح بڑھاتے چلے جائیں' اور دوسرا کام یہ ہے کہ عوام کے اندر بھی نفوذ کرکے ان کو اسلامی نظام برپا کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ تیار کرنے کی کوشش کریں۔ پہلے کام کے لیے لٹریچر کا پھیلانا آج تک جتنا مفید ثابت ہوا ہے اس سے بدرجہا زیادہ آئندہ مفید ثابت ہوسکتا ہے'...اور دوسرے کام کے لیے تبلیغ و تلقین کے دائرے وسیع کرنے کے ساتھ اصلاحِ خلق اور خدمتِ خلق کی ہر ممکن کوشش کیجیے۔ (تصریحات' ص ۳۲۲' اجتماعِ ارکان لاہور' ۱۹۷۵)

تمام جماعتوں' حلقہ ہائے متفقین اور دوسرے کارکنانِ جماعت کا فرض ہے کہ وہ اپنے حالات اور وسائل کے مطابق حسبِ ذیل قسم کے کاموں کو اپنے ہاں زیادہ سے زیادہ کرنے کی کوشش کریں۔...

غنڈہ گردی کے مقابلے میں لوگوں کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کرنا' عام طور پر لوگوں کو ظلم و ستم سے بچانا' شہریوں کے اندر اخلاقی فرائض اور ذمہ داریوں کے احساس کو بیدار کرکے ان کی ادائیگی پر ان کو آمادہ کرنا اور شہروں اور دیہات کی اخلاقی حالت کو درست کرنا۔

(صدیوں کے انحطاط کے نتیجے میں ہمارے معاشرے میں اب بدی اور برائی منظم' بے باک' جری اور ایک دوسرے کی پشت پناہ بن چکی ہے اور نیکی اور شرافت اب انتشار' پست ہمتی' بزدلی اور کمزوری کے ہم معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ اس صورت حال کو پھر سے بدلنا ہے اور نیکی اور شرافت کو منظم' بے باک' نڈر بنا کر اسے معاشرہ کے ہر گوشے میں حکمراں طاقت کی حیثیت دینا ہے۔) (آئندہ لائحہ عمل' ص ۲۰ - ۲۱)

اخلاقی گوشے میں ہمارے کارکنوں کو تین کاموں پر اپنی قوت صرف کرنی ہوگی:

(۱) غنڈہ گردی کا انسداد۔
(۲) ہر قسم کے فواحش کا انسداد۔
(۳) رشوت و خیانت کی روک تھام۔

ان اغراض کے لیے ہم صرف اخلاقی تلقین ہی پر اکتفا کرنا نہیں چاہتے، بلکہ معاشرے کے شریف عناصر کو ان برائیوں کے مقابلے میں منظم کرکے ان کے خلاف عملی جدوجہد بھی کرنا چاہتے ہیں۔ (آئندہ لائحہ عمل، ص ۸۱)

بھڑکتے ہوئے مسائل و معاملات میں دخل اور کشمکش کے ذریعے دعوت

نظام بدلتا ہی اس وقت ہے جب کہ آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کی رائے، ذہنیت، طرز فکر اور معیار پسند و ناپسند میں تغیر رونما ہوجاتا ہے۔ اور یہ تغیر آپ سے آپ اس بات کی ضمانت ہوتا ہے کہ اسی آبادی میں سے، جس نے یہ تغیر قبول کیا ہے، نئے نظام کو چلانے والے آدمی فراہم ہوجائیں گے۔

اس تغیر کی رفتار بہت سست ہوتی ہے جبکہ اس کے لیے کوشش کرنے والی تحریک زندگی کے بھڑکتے ہوئے مسائل و معاملات میں دخل دینے، اور مخالف تحریکوں اور طاقتوں کے ساتھ زور آزمائی کرنے سے گریز کرے۔ کیونکہ اس صورت میں تھوڑے لوگ ہی اس کو مجرّد اس کے خیالات اور اس کی ٹھنڈی ٹھنڈی تعمیری کوششوں کی بنا پر قابلِ اعتنا سمجھتے ہیں۔ لیکن جب وہ اپنے نظریات کی تبلیغ و دعوت کے ساتھ، آگے بڑھ کر ہر عملی مسئلے میں دخل دیتی ہے، اس میں اپنا نقطہ نظر دلائل کے ساتھ پیش کرتی ہے، مخالف قوتوں کی فکر و عمل پر مدلّل تنقید کرتی ہے، اور عملاً ان کے مقابلہ میں کشمکش شروع کردیتی ہے، تو روز بروز آبادی کا زیادہ سے زیادہ حصہ اس کی طرف متوجہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور اگر اس کی تنقید اور تعمیری فکر اور سیرت و کردار میں کوئی جان ہوتی ہے تو ہر شعبۂ زندگی میں کام کرنے والے لوگ اس کے ہم خیال بنتے چلے جاتے ہیں۔

کشمکش، اور خصوصاً جبکہ وہ زندگی کے عملی مسائل پر ہو، لمبی چوڑی کتابوں کے بغیر، خود لوگوں کو یہ سمجھا دیتی ہے کہ آپ جس چیز کو توڑنا چاہتے ہیں اس میں کیا خرابی ہے، اور جو کچھ بنانا چاہتے ہیں وہ کیا ہے اور کن اصول و نظریات پر مبنی ہے۔ اس کا کم از کم ایک واضح خلاصہ ہر اس شخص کا ذہن اخذ کرلیتا ہے جو ماحول میں سانس لے رہا ہو۔ اور کشمکش جتنی بڑھتی جاتی ہے اتنے ہی زیادہ لوگ اس سے متاثر ہو کر اپنی اپنی استعداد کے مطابق تبدیلی قبول کرتے چلے جاتے ہیں۔ (آئندہ لائحہ عمل، ص ۱۸۷ - ۱۸۹)

ہمہ جہتی دعوت

دعوت کا کام [بعض لوگ] صرف اس کو شمار کریں گے جس پر "دعوت" کا عنوان لگا ہوا ہو، اور اصلاح معاشرہ کا کام ان کے خیال میں صرف وہ ہوگا جو اسی مخصوص نام کے ساتھ کیا گیا

ہو۔ رہے وہ کام جن پر "سیاست" کا عنوان چسپاں ہو تو وہ اسے "سیاسی کام" کے خانے میں ڈال دیں گے، اور یہ تسلیم نہ کریں گے کہ اس عنوان کے تحت دعوت، توسیعِ نظام، اور اصلاحِ معاشرہ کا بھی کوئی کام ہوا ہے۔ اس طرح بعض لوگوں نے مختلف عنوانات کے خانوں میں جماعت کے کام کو تقسیم کر رکھا ہے، اور زیادہ تر یہی چیز ان کے اس دعوے کی بنیاد ہے کہ جماعت کا سیاسی کام اس کے دوسرے کاموں سے بہت بڑھ گیا ہے۔

حالانکہ ہم جو اپنے لائحہ عمل میں چار عنوانوں پر کام کو تقسیم کرکے بیان کرتے ہیں تو وہ صرف یہ سمجھانے کے لیے ہے کہ زندگی کے کن کن گوشوں میں ہمیں کن مقاصد کے لیے سعی کرنی ہے۔ اس کا یہ مطلب کبھی نہیں ہوتا، اور نہیں ہوسکتا کہ عملاً بھی یہ الگ الگ کام ہوں گے۔

واقعہ کے اعتبار سے تو ان میں سے ہر کام ایسا ہے جس میں آپ سے آپ بقیہ سارے کام بھی شامل ہوتے ہیں۔ جب آپ دعوت کا کام کریں گے تو وہ مذہبی واعظوں کے طرز پر صرف دعوت ہی نہ ہوگی بلکہ توسیعِ نظام اور اصلاحِ معاشرہ کا مقصد بھی اس کے ساتھ خود بخود پورا ہوگا اور یہی آپ کا سیاسی کام بھی ہوگا۔ دوسری طرف جب آپ سیاسی کام کرنے اٹھیں گے تو یہ دوسری سیاسی پارٹیوں کے طرز پر محض سیاسی کام ہی نہ ہوگا، بلکہ اس کا افتتاح ہی دعوتِ دین سے کیا جائے گا، اور اس کے اندر لازماً توسیعِ نظام اور اصلاحِ معاشرہ کے عناصر بھی شامل ہونگے۔ (آئندہ لائحہ عمل، ص ۲۰۲ - ۲۰۳)

یہ مفروضہ کہ یہاں محض سیاسی جدوجہد ہی سے قیادت کی تبدیلی چاہی جا رہی ہے اور اس کے ساتھ کوئی متوازی کوشش ذہنی و فکری اور اخلاقی تبدیلی کے لیے نہیں ہو رہی ہے، تو اس کے متعلق میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ خلافِ حقیقت باتوں پر استدلال کی عمارت کو اٹھانا اس نقطۂ نظر کی کمزوری کا پہلا نشان ہے جس کے حق میں استدلال کا یہ طریقہ اختیار کیا جائے۔ آخر کون آدمی، جو جماعتِ اسلامی کے حالات سے واقف ہے، انصاف کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ ہم آج تک محض سیاسی جدوجہد کے ذریعہ سے تبدیلئ قیادت کے لیے کوشاں رہے ہیں ؟ (آئندہ لائحہ عمل، ص ۱۹۰ - ۱۹۱)

دینی اور سیاسی تشخص

اور آخر وہ مذہب کون سا ہے جس کی تبلیغ کے لیے وہ ہم سے کہہ رہے ہیں ؟ اگر وہ پادریوں والا مذہب ہے جو سیاست میں دخل نہیں دیتا، تو ہم اس پر ایمان نہیں رکھتے۔ اور اگر وہ

قرآن و حدیث کا مذہب ہے جس پر ہم ایمان رکھتے ہیں، تو وہ سیاست میں محض دخل ہی نہیں دیتا بلکہ اس کو اپنا ایک جزو بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔

کوئی کہتا ہے کہ تم پہلے مذہبی لوگ تھے، اب سیاسی گروہ بن گئے ہو۔ حالانکہ ہم پر کبھی ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا ہے جب ہم غیر سیاسی مذہب کے لحاظ سے "مذہبی" رہے ہوں، اور آج خدا کی لعنت ہو ہم پر اگر ہم غیر مذہبی سیاست کے لحاظ سے "سیاسی" بن گئے ہوں۔ ہم تو "اسلام" کے پیرو ہیں اور اسی کو قائم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جتنا "مذہبی" ہے اتنے ہی ہم مذہبی ہیں اور ابتداء سے تھے اور وہ جتنا "سیاسی" ہے اتنے ہی ہم سیاسی ہیں اور ابتداء سے تھے۔ تم نے نہ کل ہمیں سمجھا تھا جب کہ ہم کو "مذہبی" گروہ قرار دیا۔ اور نہ آج سمجھا ہے جب کہ ہمارا نام "سیاسی جماعت" رکھا۔ سیاست اور مذہب میں تمہارا استاد یورپ ہے۔ اس لیے نہ تم نے اسلام کو سمجھا اور نہ ہمیں۔ (جماعتِ اسلامی کا مقصد، تاریخ اور لائحہ عمل، ۱۹۵۱، ص ۱۴)

میں خود نہ سپاسناموں کو پسند کرتا ہوں نہ پھولوں کے ہاروں اور ان کی بارش کو۔ یہ سب کچھ میری مرضی کے بغیر، بلکہ اس کے خلاف ہی ہوتا رہا ہے اور مجھے مجبوراً اس لیے گوارا کرنا پڑا ہے کہ ایک طرف سے اخلاص و محبت کا اظہار اگر کسی نامناسب صورت میں ہو تو دوسرا فریق بسا اوقات سخت مشکل میں پڑ جاتا ہے۔

آپ ہی بتایئے کہ اگر میں کسی جگہ جا کر اتروں اور وہاں بہت سے لوگ ہار لے کر آگے بڑھیں تو کیا یہ کوئی اچھا اخلاق ہوگا کہ میں ان لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ شروع کردوں اور ان سے کہوں کہ لے جاؤ اپنے ہار، میں انہیں قبول نہیں کرتا۔ یا میں کسی دعوت میں بلایا جاؤں اور عین وقت پر مجھے معلوم ہو کہ داعیوں نے ایک سپاسنامہ نہ صرف تیار کرا رکھا ہے بلکہ طبع بھی کرالیا ہے اور میں کہوں کہ رکھو اپنا سپاسنامہ۔

یہ چیزیں اگر قطعی حرام ہوتیں تو میں ان کو رد کردینے اور ان کے مرتکبین کو ملامت کرنے میں حق بجانب بھی ہوتا۔ مگر محض کراہت اور خوفِ فتنہ کم از کم میرے نزدیک اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ میں اس پر سختی برتوں اور ان لوگوں کی دل شکنی کروں جو بہرحال مجھ سے کسی دنیوی غرض کی بنا پر محبت نہیں رکھتے۔ میں زیادہ سے زیادہ یہی کرسکتا ہوں اور یہی کر بھی رہا ہوں کہ لوگوں سے یہ طریقِ اظہارِ اخلاص چھوڑ دینے کی گزارش کروں۔ اس سے زیادہ اگر مجھے کچھ کرنا چاہیے تو وہ آپ مجھے بتا دیں۔

(ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۵۵، رسائل و مسائل)

معیارِ مطلوب، بگاڑ اور تربیت

معیارِ مطلوب

جماعت کے ارکان . . . ایک بہت بڑی دعویٰ لے کر بہت بڑے کام کے لیے اٹھ رہے ہیں۔ اگر ان کی سیرتیں ان کے دعویٰ کی نسبت سے اس قدر پست ہوں کہ نمایاں طور پر ان کی پستی محسوس ہوتی ہو تو وہ اپنے آپ کو اور اپنے دعوے کو مضحکہ بنا کر رکھ دیں گے . . . جس بستی میں بھی آپ موجود ہوں وہاں عام آبادی سے آپ کے اخلاق بلند تر ہونے چاہئیں، بلکہ آپ کو بلندیٔ اخلاق، پاکیزگیٔ سیرت اور دیانت و امانت میں ضرب المثل بن جانا چاہیے۔ (روداد، اوّل، ص ۴۸)

ابتدائی بگاڑ

میں سمجھتا ہوں کہ ہماری انتہائی احتیاط کے باوجود ایک اچھی خاصی جماعت ہمارے نظام میں ایسی داخل ہوگئی ہے جسے فی الواقع اس کام سے کوئی گہری دلچسپی نہیں ہے۔ دلچسپی کے اس فقدان کی نمایاں علامت یہ ہے کہ یہاں اجتماع کے لیے دعوتِ عام دی گئی تھی، اور اعلان کیا گیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ ارکان شریک ہونے کی کوشش کریں، مگر بہت سے ارکان کسی عذرِ معقول کے بغیر نہیں آئے، بلکہ بہت سوں نے عذر پیش کرنے کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔ لوگوں کے لیے ان کے معمولی کام، ان کے روزمرہ کے مشاغل، ان کے خانگی امور، ان کے دنیوی مفاد اس سے بڑھ کر اہمیت رکھتے ہیں کہ وہ جماعت کی پکار پر لبیک کہیں، اور اسی بنا پر وہ غیر اولی الضَّرَر ہونے کے باوجود بیٹھے رہ گئے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارے بہت سے رفقاء کو اس کام سے حقیقی دلچسپی و دل بستگی نہیں ہے۔ . . .

یہ سرد مہری جس کا اظہار اس اجتماع کے موقع پر ہوا ہے، کوئی اتفاقی چیز نہیں ہے جو اس وقت رونما ہوئی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ متعدد مقامات پر ہماری جماعت کے بعض یا اکثر ارکان ہفتہ وار اجتماعات میں شریک نہیں ہوتے، یا شریک ہوتے ہیں تو التزام کے ساتھ نہیں بلکہ "گنڈے دار" طریقے سے کہ جب دنیا کی کوئی چھوٹی بڑی مشغولیت انہیں نہ ہوئی اور تفریح کو بھی جی چاہا تو مقامی جماعت کے اجتماع میں آگئے۔ بعض مقامات پر ہفتہ وار اجتماع کا قاعدہ ہی سرے سے منسوخ کردیا گیا ہے۔

اور بہت سے ارکان ایسے بھی ہیں جو جماعت میں داخل ہونے اور جان بوجھ کر خدا سے عہد غلامی تازہ کرنے کے بعد ویسے ہی ٹھنڈے، بے روح اور جامد و ساکن ہیں جیسے اس سے پہلے

تھے۔ نہ ان کی زندگی میں کوئی تغیر واقع ہوا' نہ جاہلیت کے ماحول سے ان کی کوئی جنگ ٹھنی' نہ دعوت الی اللہ کے لیے کوئی سرگرمی ان میں پیدا ہوئی اور نہ ہم سفر رفیقوں کے ساتھ وابستگی ان کے اندر پائی گئی۔ حالانکہ ہم نے ابتدا میں جماعت قائم کرتے وقت بھی کہہ دیا تھا' اور اس کے بعد بھی بار بار کہتے رہے ہیں کہ ہمیں کثرتِ تعداد کی نمائش کرنے کے لیے ارکان کی فضول بھرتی نہیں کرنی ہے۔ ہمیں وہ فربہی مطلوب نہیں ہے جو جسم کو طاقت ور بنانے کے بجائے الٹا بوجھل بنا دے' ہمیں صرف ان لوگوں کی ضرورت ہے جنہیں فی الواقع کچھ کرنا ہو اور جو کسی خارجی دباؤ سے نہیں بلکہ ایمان کے اندرونی تقاضے سے خدا کے دین کو قائم کرنے کی سعی کرنا چاہتے ہوں۔ لیکن افسوس ہے کہ ان پے در پے تصریحات کے باوجود اس قسم کے لوگ ہمارے اس نظام میں بھی داخل ہوگئے۔ (رُوداد' دوم' ص ۱۳ - ۱۵)

حقیقت پسندانہ روش

میرا مدعا آپ لوگوں کو صرف یہ احساس دلانا ہے کہ اپنے کام کا جائزہ لیتے وقت نہ مثبت پہلو میں مبالغہ سے کام لینا چاہیے' اور نہ منفی پہلو میں۔ بسا اوقات آدمی خود جامد ہوتا ہے' اور اپنا جمود اسے ساری جماعت میں نظر آنے لگتا ہے۔ بسا اوقات آدمی بہت زیادہ پرجوش ہوتا ہے' اور جماعت کو جب وہ اپنی توقعات اور تمناؤں کے مطابق تیز رفتار نہیں پاتا تو کہتا ہے کہ اس پر جمود طاری ہے۔ بسا اوقات ایک شخص اپنے ذہن میں کام کا کوئی خاص نقشہ یا تصوّر رکھتا ہے' اور جب جماعت اس نقشے یا تصوّر پر کام کرتی نظر نہیں آتی تو وہ خیال کرتا ہے کہ جماعت کوئی کام نہیں کر رہی ہے ۔ (تصریحات' ص ۳۱۶ - ۳۱۷' اجتماعِ ارکان لاہور' ۱۹۷۵)

معیار اور اطمینانِ کامل

میرے علم میں ایسا کوئی طریقِ تربیت اب تک نہیں آیا ہے جو معیارِ مطلوب کے آدمی تیار کرنے کی سو فی صدی ضمانت دیتا ہو۔ اس کی آپ جتنی چاہیں کوشش کر دیکھیں' ہر جائزہ آپ کو یہی رپورٹ دے گا کہ آپ کے درمیان ایک ناقابلِ اطمینان عنصر موجود ہے۔ بلکہ بحیثیتِ مجموعی پوری جماعت کے متعلق بھی ہر پہلو سے کامل اطمینان کی رپورٹ شاید آپ کبھی نہ پاسکیں گے۔ (آئندہ لائحہ عمل' ص ۱۷۷)

بگاڑ اور سیاسی کام

[بعض لوگوں] کے نزدیک جماعت کی دینی و اخلاقی حالت گر گئی ہے' اس لیے ضرورت ہے

کہ پہلے سیاسی جدوجہد سے ہٹ کر کارکنوں کے اخلاق بنائے جائیں' پھر اس میدان میں واپس آیا جائے۔

اس کے متعلق میں یہ عرض کروں گا کہ اگر ساری جماعت بحیثیتِ مجموعی بگڑ گئی ہے تو اسے توڑ دیجیے' کیونکہ ہم بگاڑ کو سنوارنے کے لیے اٹھے تھے' بگڑی ہوئی جماعتوں میں ایک اور جماعت کا اضافہ کرنے کے لیے نہیں اٹھے تھے۔ لیکن اگر پورے مجموعے پر یہ ہمہ گیر حکم محض مبالغہ ہے' اور امرِواقعی صرف اس قدر ہے کہ جماعت میں کچھ افراد معیار سے گرے ہوئے پائے جاتے ہیں' تو اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ سارا قافلہ ان چند افراد کی خاطر رک کر کھڑا ہو جائے' اور جب تک وہ درست نہ ہوجائیں' آگے کا سفر ملتوی رہے۔ (آئندہ لائحہ عمل' ص ۱۷۴ - ۱۷۵)

اگر اس پروگرام کے سیاسی جزو کو معطل کرنا اس لیے ناگزیر ہوگیا ہے کہ جماعت میں کچھ عناصر دینی و اخلاقی حیثیت سے گر گئے ہیں تو اس سے زیادہ ناگزیر یہ ہے کہ دعوت و تبلیغ اور اصلاحِ معاشرہ اور توسیعِ جماعت کے کام کو بھی معطل کر دیا جائے' کیونکہ گری ہوئی دینی و اخلاقی حالت کے ساتھ دعوت الی اللہ کیسی' اور معاشرے کی اصلاح کے کیا معنی' اور صالح افراد کی تلاش و تنظیم کا کیا موقع ؟ اس دلیل سے تو جماعت کا پروگرام اب صرف اپنے موجودہ ارکان کی تربیت تک محدود رہنا چاہیے' اور یہ طے ہوجانا چاہیے کہ جب تک سارے ارکان پورے معیاری رکن نہ ہوجائیں' پبلک میں جا کر کوئی دعوتی یا اصلاحی یا سیاسی کام نہ کیا جائے۔ (آئندہ لائحہ عمل' ص ۱۷۶ - ۱۷۷)

صحیح سوچ اور روش

کتابی شخصیتیں واقعی شخصیتوں سے اچھی خاصی مختلف ہوتی ہیں۔ ایک گزرے ہوئے زمانے کے جو نقشے صفحہ قرطاس پر کھینچے جاتے ہیں' گوشت پوست کی دنیا میں بعینہٖ وہ نقشے کبھی پیدا نہیں کیے جاسکتے۔ لہٰذا جس شخص کو خیالی دنیا میں نہ رہنا ہو بلکہ واقعی دنیا میں کچھ کرنا ہو اسے اس خیالِ خام میں مبتلا نہ ہونا چاہیے کہ گوشت پوست کے انسان کبھی بشری کمزوریوں سے بالکل منزہ اور تمام مثالی کمالات کا مرقع بن سکیں گے۔

آپ حدِّ کمال کو نگاہوں سے اوجھل تو نہ ہونے دیں' اور اس تک خود پہنچنے اور دوسروں کو پہنچانے کی کوشش بھی جاری رکھیں' مگر جب عملاً خدا کی راہ میں کام کرنا اور ہزارہا آدمیوں سے کام لینا ہو تو قرآن و سنت کے مطابق دین کے تقاضوں اور مطالبات کی حدِّ اوسط آپ کو نگاہ میں رکھنی پڑے گی جس پر آپ کا اور آپ کے ساتھیوں کا قائم ہوجانا راہِ خدا میں کام کرنے کے لیے

کافی ہو' اور جس سے نیچے گر جانا قابلِ برداشت نہ ہو۔ یہ حدِّ اوسط خود ساختہ نہ ہونی چاہیے' اس کا ماخذ خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت ہی ہونی چاہیے۔ لیکن بہرحال اس کو حد سمجھنا اور نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ اس کے بغیر کوئی عملی کام آدمی نہیں کرسکتا۔

صدرِ اوّل میں جن لوگوں سے خدا کا کام لیا گیا تھا وہ سب بھی نہ یکساں تھے اور نہ ان میں سے کوئی بشری کمزوریوں سے مبرّا تھا۔ آج بھی جن لوگوں کے ہاتھوں یہ کام ہوگا وہ ہر طرح کی کمزوریوں سے پاک نہ ہوں گے۔ یہ خوبی نظامِ جماعت میں ہونی چاہیے کہ وہ مجموعی طور پر ایک صالح اور حکیمانہ نظام ہو اور اس کے اندر یہ استعداد بھی موجود ہو کہ افراد اس میں شامل ہو کر دینِ حق کی زیادہ سے زیادہ خدمت انجام دیں اور ان کی کمزوریاں بروئے کار آنے کے کم سے کم مواقع پائیں۔

ان سب الجھنوں سے بچ نکلنے کے بعد پھر بھی آدمی کے دل میں یہ خلجان باقی رہ جاتا ہے کہ اپنے جن رفقاء کے ساتھ وہ اقامت دین کے لیے کام کر رہا ہے وہ معیار مطلوب سے بہت نیچے ہیں اور ان کے اندر بہت سے پہلوؤں مین ابھی بہت خامیاں پائی جاتی ہیں۔ اس خلجان سے میں نے اپنے کسی رفیق کو بھی خالی نہیں پایا ہے اور میں خود بھی اس سے خالی نہیں ہوں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر یہ خلجان ہمیں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی خامیاں دور کرنے پر اکساتا ہے اور ان صحیح ذرائع و وسائل کی تلاش اور ان کے استعمال پر آمادہ کرتا ہے جن سے یہ خامیاں دور ہوں' تو مبارک ہے یہ خلجان۔ اسے گھٹنا نہیں' بلکہ بڑھنا چاہیے۔ کیوں کہ ہماری ساری اخلاقی و روحانی ترقی کا انحصار اسی خلجان کی پیدا کی ہوئی خلش پر ہے۔ جس روز یہ مٹا اور ہم اپنی جگہ مطمئن ہوگئے کہ جو کچھ ہمیں بننا چاہیے تھا وہ ہم بن چکے' اسی روز ہماری ترقی بند ہو جائے گی' اور ہمارا تنزل شروع ہو جائے گا۔ لیکن اگر یہ خلجان ہمیں مایوسی اور فرار پر آمادہ کرتا ہو تو یہ خلجان نہیں وسوسۂ شیطان ہے۔ جب بھی اس کی کھٹک محسوس ہو لاحول ولاقوۃ الا باللہ پڑھیے اور اپنے کام میں لگ جایئے۔

اگر آپ واقعی خدا کا کام کرنے اٹھے ہیں تو خوب سمجھ لیجئے کہ ایسے وساوس سے اپنے دل کو فارغ کیے بغیر آپ کچھ نہ کرسکیں گے۔ اس وقت شیطان کے لیے اس سے زیادہ مرغوب کوئی کام نہیں ہے کہ آپ کے سامنے جماعتِ اسلامی کی ہر خوبی کو بے قدر اور بے وزن کرکے پیش کرے۔ اور اس کی یا اس کے افراد کی ہر کمزوری کو بڑھا چڑھا کر دکھائے تاکہ آپ کسی نہ کسی طرح دل چھوڑ بیٹھیں۔ (رسائل و مسائل' دوم' ص ۵۶۳ – ۵۶۵ ۔ ترجمان القرآن' نومبر ۱۹۵۱ء)

انتخابات

واحد طریقہ، انتخابات

تین حقیقتیں واضح طور پر آپ کی نگاہ میں رہنی چاہئیں :

پہلی یہ کہ آپ اس ملک میں اسلامی نظام زندگی عملاً قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس کے لیے قیادت کی تبدیلی ناگزیر ہے۔

دوسری یہ کہ آپ جس ملک میں کام کر رہے ہیں وہاں ایک آئینی و جمہوری نظام قائم ہے اور اس نظام میں قیادت کی تبدیلی کا ایک ہی آئینی راستہ ہے ---- انتخابات۔

تیسری یہ کہ ایک آئینی و جمہوری نظام میں رہتے ہوئے تبدیلی قیادت کے لیے کوئی غیر آئینی راستہ اختیار کرنا شرعاً آپ کے لیے جائز نہیں ہے، اور اس بنا پر آپ کی جماعت کے دستور نے آپ کو اس امر کا پابند کیا ہے کہ آپ اپنے پیش نظر اصلاح و انقلاب کے لیے آئینی و جمہوری طریقوں ہی سے کام کریں۔

ان تین حقیقتوں کو ملا کر جب آپ غور کریں گے تو بالکل منطقی طور پر نتیجہ وہی نکلے گا جو قرار داد [ماچھی گوٹھ] میں بیان کیا گیا ہے۔ آپ انتخابات میں آج حصہ لیں، دس، بیس، پچاس برس بعد، بہرحال اگر آپ کو یہاں کبھی اسلامی نظامِ زندگی قائم کرنا ہے تو راستہ آپ کو انتخابات ہی کا اختیار کرنا پڑے گا۔ (آئندہ لائحہ عمل، ص ۲۰۵ - ۲۰۶)

انتخابات کے علاوہ جمہوری طریقے

بکثرت لوگ اس الجھن میں پڑ گئے ہیں، کہ آیا جمہوری طریقوں سے یہاں کوئی تبدیلی لائی جاسکتی ہے یا نہیں، اور ایک اچھی خاصی تعداد یہ سمجھنے لگی ہے کہ ایسے حالات میں غیر جمہوری طریقے اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ . . . لیکن ہم اپنی اس رائے پر قائم ہیں کہ اسلامی نظام، جسے برپا کرنے کے لیے ہم اٹھے ہیں، جمہوری طریقوں کے سوا کسی دوسری صورت سے برپا نہیں ہوسکتا، اور اگر کسی دوسرے طریقے سے برپا کیا بھی جاسکے تو وہ دیرپا نہیں ہوسکتا۔

. . . آپ جمہوری طریقوں کا مطلب واضح طور پر جان لیں۔ غیر جمہوری طریقوں کے مقابلے میں جب جمہوری طریقوں کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ نظامِ زندگی میں جو تبدیلی بھی لانا، اور ایک نظام کی جگہ جو نظام بھی قائم کرنا مطلوب ہو، اسے زور زبردستی سے لوگوں پر مسلط نہ کیا جائے، بلکہ عامتہ الناس کو سمجھا کر اور اچھی طرح مطمئن کرکے

انہیں ہم خیال بنایا جائے اور ان کی تائید سے اپنا مطلوبہ نظام قائم کیا جائے۔

اس کے لیے یہ لازم نہیں ہے کہ عوام کو اپنا ہم خیال بنا لینے کے بعد غلط نظام کو صحیح نظام سے بدلنے کے لیے ہر حال میں صرف انتخاب ہی پر انحصار کرلیا جائے۔... جہاں انتخابات کے راستے سے تبدیلی کا آنا غیر ممکن بنا دیا گیا ہو' وہاں جباروں کو ہٹانے کے لیے رائے عامہ کا دباؤ دوسرے طریقوں سے ڈالا جاسکتا ہے۔... غیر مقبول نظام کو عوامی دباؤ سے بدلنا قطعاً" غیر جمہوری نہیں ہے۔(تصریحات' ص ۳۲۰ - ۳۲۱' اجتماع ارکان لاہور' ۱۹۷۵)

بالواسطہ انتخابات

انتخابات میں بلا واسطہ کے ساتھ بالواسطہ حصہ لینے کا مطلب کیا ہے' اور وہ کیا مصالح ہیں جن کی بنا پر یہ دوسرا طریقہ بھی اس پالیسی میں شامل کیا گیا ہے ؟

جہاں تک بالواسطہ کے مفہوم کا تعلق ہے' اس میں بجائے خود کوئی پیچیدگی نہیں ہے ۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہم براہِ راست اپنے اہتمام سے کچھ لوگوں کو بھیجنے کے ساتھ ایسے عناصر کو بھی کامیاب کرانے کی کوشش کریں گے جو اسلامی نظام کے مقصد میں ہم سے متفق ہیں اور جن سے ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ اس کے قیام کی کوشش میں مدد گار بن سکیں گے۔ لیکن اصل پیچیدگی ان مصالح کو سمجھنے میں پیش آتی ہے جن کی بنا پر ہم اپنی پالیسی میں اس چیز کو شامل کر رہے ہیں۔ اس کو سمجھنے کے لیے ہمیں ان حالات پر ایک نگاہ ڈالنی چاہیے جن میں ہم کو یہ دشوار گزار گھاٹی طے کرنی ہے۔

حالات کا ایک رخ یہ ہے کہ نئے دستور کی رو سے سارے ملک کی صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کی ۹ سو سے کچھ زیادہ نشستیں ہیں' جن پر بیک وقت انتخابی مقابلہ درپیش ہوگا ۔ ہمارے پاس اس وقت اتنے ذرائع موجود نہیں ہیں کہ ہم ان تمام نشستوں پر' یا ان کی اکثریت پر بلاواسطہ مقابلہ کرسکیں۔ صرف اس کے مصارف ہی کا آپ اندازہ کریں تو آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ یہ کام ہمارے لیے کس قدر مشکل ہے۔

دوسرا رخ یہ ہے کہ جماعت کے اثرات سارے ملک میں یکساں نہیں ہیں۔ کچھ حلقے ایسے ہیں جن میں ہم اتنی طاقت رکھتے ہیں کہ براہ راست خود اپنے انتخابی نظام کے تجویز کردہ آدمیوں کو کامیاب کرا لینا ہمارے لیے ممکن ہے۔ لیکن بہت سے حلقے ایسے بھی ہیں جن میں ہماری طاقت اس پیانے کی تو نہیں ہے' البتہ اتنی ضرور ہے کہ ہماری تائید کسی اچھے اور مفید آدمی کی کامیابی

کے لیے ' اور ہماری مخالفت کسی برے آدمی کو روکنے کے لیے موثر ہو سکتی ہے۔ ایسے حلقوں میں اپنی اس طاقت کو معطل رکھنا اور اسے کسی مصرف میں نہ لانا کوئی دانشمندی نہیں ہے۔

تیسرا رخ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں جماعتِ اسلامی سے باہر بھی ایسے گروہ اور افراد موجود ہیں جو لادینی کے مخالف اور دینی نظام کے حامی ہیں۔ ہماری پہلے بھی یہ خواہش اور کوشش رہی ہے' اور اب بھی یہ ہونی چاہیے کہ لادینی کی حامی طاقتوں کے مقابلہ میں ان تمام عناصر کے درمیان اتفاق اور باہمی تعاون ہو' اور ان کی قوتیں ایک دوسرے کی مزاحمت میں صرف ہو کر مخالف دین عناصر کے لیے مدد گار نہ بنیں۔ یہی کوشش ہمیں آئندہ انتخابات میں بھی کرنی ہے تاکہ آئندہ اسمبلیوں میں اسلامی نقطہ نظر کی وکالت کرنے کے لیے ہماری پارلیمنٹری پارٹی تنہا نہ ہو بلکہ ایک اچھی خاصی تعداد دوسرے ایسے لوگوں کی بھی موجود رہے جو اس خدمت میں اس کا ساتھ دینے والے ہوں۔ اس لیے ہم دل سے یہ چاہیں گے کہ جن حلقوں میں ہم براہ راست انتخابی مقابلہ نہیں کر رہے ہیں وہاں ہماری طاقت بے کار ضائع ہونے کے بجائے کسی حامی دین گروہ یا فرد کے حق میں استعمال ہو۔ بلکہ ہم اس حد تک بھی بڑھ جائیں گے کہ جہاں ایسا کوئی گروہ یا فرد نہیں اٹھ رہا ہے وہاں کسی نیک اور موزوں آدمی کو خود اٹھنے کا مشورہ دیں اور اپنی تائید سے اس کو کامیاب کرانے کی کوشش کریں' بشرطیکہ اس کے اپنے اثرات بھی اس کے حلقے میں کافی ہوں' اور اس کی انتخابی جدوجہد کا سارا بار ہم پر نہ آ پڑے۔

حالات کے ان تینوں پہلوؤں کو نگاہ میں رکھ کر جب آپ غور کریں گے تو آپ کو پوری طرح اطمینان ہو جائے گا کہ اس قرارداد کی تجویز کردہ انتخابی پالیسی میں بلاواسطہ کے ساتھ بالواسطہ کی گنجائش ٹھیک رکھی گئی ہے۔ یہ دراصل ایک خلا تھا جو ہماری سابق پالیسی میں پایا جاتا تھا۔ تجربے' اور حالات کے مشاہدے نے ہم کو یہ احساس دلایا کہ اس کو بھرنا حکمت کا تقاضا ہے۔ (آئندہ لائحہ عمل' ص ۲۳۲ - ۲۳۵)

وسیع پالیسی

رہی یہ بات کہ آپ انتخابات میں کس طرح حصہ لیں' تو اس کے لیے ایک وسیع پالیسی بنا کر مجلس شوریٰ کو دے دیجئے' اور اس کی تفصیلات اس اجتماع عام میں طے کرکے اپنے ہاتھ نہ باندھ لیجئے۔ کیونکہ جتنے جزئیات کا فیصلہ کرکے آپ چلے جائیں گے انہیں بدلنے کی اگر کبھی ضرورت پیش آگئی تو پھر اجتماعِ عام ہی بلانا پڑے گا اور آپ جانتے ہیں کہ بات بات پر اتنا بڑا اجتماع منعقد کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ (آئندہ لائحہ عمل' ص ۲۳۷)

حکمتِ عملی کے اصول

تبدیلی، جمود، اور زائد از شریعت پابندیاں

میرے نزدیک کوئی گروہ، اسی زمانے میں نہیں کسی زمانے میں بھی، جاہلیت سے لڑ کر اسلامی نظامِ زندگی قائم کرنے کے قابل نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ تجربات سے سبق سیکھ کر، اور حالات کو سمجھ کر، اپنی پالیسیوں میں ایسا ردّ و بدل نہ کرتا رہے جس کی حدودِ شرع کے اندر گنجائش ہو۔ آپ کو اگر فی الواقع یہ کام کرنا ہے اور صرف تبلیغ کا فرض انجام دے کر نہیں رہ جانا ہے تو اپنے اوپر ان پابندیوں کو کافی سمجھیے جو خدا اور رسولؐ کی شریعت نے آپ پر عائد کی ہیں اور اپنی طرف سے کچھ زائد پابندیاں عائد نہ کرلیجئے۔ شریعت پالیسی کے جن تغیرات کی وسعت عطا کرتی ہو، اور عملی ضروریات جن کی متقاضی بھی ہوں، ان سے صرف اس بنا پر اجتناب کرنا کہ پہلے ہم اس سے مختلف کوئی پالیسی بنا چکے ہیں، ایک بے جا جمود ہے۔ اس جمود کو اختیار کرکے آپ "اصول پرستی" کا فخر کرنا چاہیں تو کرلیں، مگر یہ حصول مقصد کی راہ میں چٹان بن کر کھڑا ہو جائے گا، اور اس چٹان کو کھڑا کرنے کے آپ خود ذمہ دار ہوں گے، کیونکہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے اسے کھڑا نہیں کیا ہے۔ (آئندہ لائحہ عمل، ص ۲۳۵ - ۲۳۶)

اصول و مقصد اور حالات کے تقاضے

"پاکستان کے موجودہ حالات میں، عوام کے رجحانات کو سامنے رکھتے ہوئے" ہماری سیاسی پالیسی کیا ہونی چاہیے، میں اس کا ایک اصولی جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں، تاکہ ہمارے رفقاء کسی غلط طرزِ فکر میں مبتلا نہ ہوجائیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہم جس ملک میں، جس قوم میں، جس زمانے میں، اور جن حالات میں کام کر رہے ہیں، ہمیں کوئی پروگرام بناتے ہوئے ان سب کو ملحوظ رکھنا پڑے گا۔ لیکن ہماری اصولی دعوت لازماً ایک ہی رہے گی، ہمارا بنیادی مقصد بھی قطعاً ناقابلِ تغیر ہوگا، اور اپنا عملی پروگرام بناتے ہوئے ہم ان چیزوں کو صرف اس حیثیت سے ملحوظ رکھیں گے کہ اس ملک میں، اس زمانے کے حالات میں، ہم اپنی دعوت کو کس طریقے سے فروغ دیں، اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے اس قوم کے اچھے رجحانات سے کس طرح فائدہ اٹھائیں، اور اس کے برے رجحانات کو کس طرح بدلیں کہ وہ ہمارے مقصد کی راہ میں کم از کم رکاوٹ تو نہ بن سکیں۔ اس نقطہ نظر سے ان چیزوں کو ملحوظ رکھنا تو عین تقاضائے حکمت ہے، لیکن اگر ہم زمان و مکان کے حالات اور لوگوں کے رجحانات کو دیکھ کر اپنی دعوت اور اپنے مقصد ہی پر نظرِ ثانی

کرنے بیٹھ جائیں تو یہ سراسر گمراہی ہے جس کا خیال تک ہمارے ذہن میں نہ آنا چاہیے۔

طریق کار حالات کے لحاظ سے بدلا جاسکتا ہے۔ حکمت عملی میں لوگوں کے اچھے یا برے رجحانات کے لحاظ سے تغیر کیا جاسکتا ہے۔ مگر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام اور اس کی دعوت کے جو اصول مقرر کر دیے ہیں، ان میں ذرہ برابر کوئی ردّ و بدل لوگوں کے رجحانات یا زمانے کے حالات کو دیکھ کر نہیں کیا جاسکتا۔

اللہ اور اس کے رسولؐ نے جس چیز کو قائم کرنے کا حکم دیا ہے، ہمیں ہر حال میں اسی کو قائم کرنے کی کوشش کرنی ہوگی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم جس ملک میں کام کر رہے ہوں، اس کے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ہم اس مقصد کے لیے سعی و جہد کے ایک طریقے کو موزوں پاکر اختیار کرلیں اور دوسرے طریقے کو ناموزوں سمجھ کر ترک کردیں۔ اسی طرح جن چیزوں کو اللہ اور اس کے رسولؐ مٹانا چاہتے ہیں ان کو مٹانا ہی ہماری کوششوں کا ہمیشہ مقصود رہے گا، یہ اور بات ہے کہ ہم اپنی استطاعت اور ملک کے حالات، اور عوام کی مزاجی کیفیات کو دیکھ کر یہ طے کریں کہ کن چیزوں کو مٹانے کی کوشش مقدم اور کن کے مٹانے کی کوشش مؤخر رکھی جانی چاہیے۔ نیز یہ کہ اس غرض کے لیے ہم کونسی تدابیر اختیار کرسکتے ہیں اور کن تدابیر کا اختیار کرنا غیر ممکن، غیر مفید، یا غیر مناسب ہے۔ (تصریحات، ص ۳۰۴ - ۳۰۵، اجتماع ارکان لاہور، ۱۹۷۵)

جو بات ہم یقین سے سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ کسی مصنوعی ذریعے سے اگر کوئی ایسا انقلاب برپا کر دیا جائے جس کے لیے معاشرہ ذہنی و اخلاقی حیثیت سے تیار نہ ہو تو وہ انقلاب کبھی پائیدار نہیں ہوسکتا اور معاشرے کو تیار کرنا ایک محنت طلب کام ہے۔ . . . جب معاشرے کو ایک حد تک تیار کرلیا جائے، اس کے بعد انقلاب برپا کرنے کے لیے ہر وہ تدبیر کی جاسکتی ہے جو جائز بھی ہو، اور ان حالات میں کارگر بھی ہو جن میں ہم کام کر رہے ہیں۔ اپنے وقت اور اپنے ملک کے حالات کو نظر انداز کرکے کوئی سکیم نہیں بنائی جاسکتی، اور اگر بنائی جائے تو یہ ناکامی پر منتج ہوگی۔ (تصریحات، ص ۳۱۰)

اسلامی تحریک کے لیے ساری دنیا میں کوئی ایک لگا بندھا طریق کار نہیں ہوسکتا۔ مختلف ممالک کے حالات مختلف ہیں، اور ہر جگہ کام کرنے والوں کو اپنے حالات کے مطابق ایک طریق کار اختیار کرنا ہوگا۔ البتہ جو چیز مشترک رہے گی وہ اصول اور مقصد ہے جس کا منبع قرآن و سنت ہے۔ . . .

جو گروہ جس ملک اور معاشرے میں اس تحریک کے لیے کام کرنے اٹھے، اس کا یہ فرض ہے

کہ اعتقاد اور عمل میں کتاب و سنت کی تعلیمات کا پورا اتباع کرے، اور اقامتِ دین کو اپنا مقصود بنا کر اپنی تمام مساعی اس پر مرکوز رکھے۔ اس کے بعد اپنی تحریک کے لیے عملی پروگرام طے کرنا ہر علاقے کے لوگوں کا اپنا کام ہے، اور ان میں اتنی حکمت ہونی چاہیے کہ وہ اپنی قوت، ذرائع اور حالات کے لحاظ سے اقامت دین کے لیے مناسب ترین طریق کار تجویز کریں۔ (تصریحات، ص ۱۸۴ - ۱۸۵، انٹرویو ۱۹۶۸)

حکمت کا تقاضا

حکمت یہ ہے کہ آپ بس ایک ہی لگی بندھی راہ پر آنکھیں بند کرکے چلنے کے عادی نہ ہوں، بلکہ آپ میں یہ صلاحیت ہو کہ ایک راستہ بند ہوتے ہی دس دوسرے راستے بروقت نکال لیں۔ جس شخص میں حکمت نہیں ہوتی وہ ایک راہ کو بند پاکر بیٹھ جاتا ہے، اور اس کے ساتھ اگر وہ بے صبر بھی ہو تو پھریا تو اس رکاوٹ سے اپنا سر پھوڑ لیتا ہے یا رہروی سے ہی باز آجاتا ہے، مگر جسے اللہ نے حکمت اور صبر دونوں سے نوازا ہو وہ جوئے رواں کی طرح ہوتا ہے جس کی منزل کوئی چیز بھی کھوٹی نہیں کرسکتی۔ چٹانیں منہ دیکھتی رہ جاتی ہیں اور دریا کسی اور طرف سے اپنی منزل کی طرف بہہ نکلتا ہے۔

ہمارے لیے اپنا پیغام پہنچانے اور اپنی دعوت کو پھیلانے کی بس یہی ایک صورت نہیں ہے کہ ہم جلسوں میں تقریریں کریں اور ہزاروں آدمی انہیں سنیں۔ بلاشبہ یہ بھی اس کام کی ایک صورت ہے، لیکن اگر اسے ہمارے لیے بند کردیا گیا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ تین تین چار چار آدمیوں کے وفود کی شکل اختیار کرلیں اور پورے شہر لاہور میں پھیل جائیں۔ گھر گھر اور دوکان دوکان اور مسجد مسجد جایئے، فرداً فرداً لوگوں سے ملیے ایک ایک شخص کو بتایئے کہ جماعت اسلامی کیا ہے۔ . . . اس تبلیغ سے جو لوگ متاثر ہوں ان کو متفقین میں شامل ہونے کی دعوت دیجیے۔

(۲۵ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو جماعت اسلامی کے کل پاکستان اجتماع عام سے خطاب)

حکمتِ عملی

ہم اپنی تحریک خلا میں نہیں چلا رہے ہیں بلکہ واقعات کی دنیا میں چلا رہے ہیں۔ اگر ہمارا مقصد محض اعلان و اظہار حق ہوتا تو ہم ضرور صرف بے لاگ حق بات کہنے پر اکتفا کرتے۔ لیکن ہمیں چونکہ حق کو قائم بھی کرنے کی کوشش کرنی ہے اور اس کی اقامت کے لیے اسی واقعات کی دنیا میں سے راستہ نکالنا ہے، اس لیے ہمیں نظریات اور حکمتِ عملی کے درمیان توازن برقرار

رکھتے ہوئے چلنا پڑتا ہے۔

آئیڈیلزم کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے آخری مقصود کو نہ صرف خود پیش نظر رکھیں بلکہ دنیا کو بھی اس کی طرف بلاتے اور رغبت دلاتے رہیں۔ اور حکمتِ عملی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے مقصود کی طرف بتدریج بڑھیں اور واقعات کی دنیا میں ہم کو جن حالات سے سابقہ ہے ان کو اپنے مقصد کی طرف موڑنے' اس کے لیے مفید بنانے اور مزاحمتوں کو ہٹانے کی کوشش کرتے رہیں۔

اس غرض کے لیے ہمیں اپنے آخری مقصد کے راستے میں کچھ درمیانی مقاصد اور قریب الحصول مقاصد بھی سامنے رکھنے ہوتے ہیں' تاکہ ان میں سے ایک ایک کو حاصل کرتے ہوئے ہم آگے بڑھتے جائیں۔...

اسی طرح ... یہاں ایک کھلی کھلی لادینی ریاست کا قائم ہوجانا ہمارے مقصد کے لیے اس سے بہت زیادہ نقصان دہ ہوتا جتنا اب اس نیم دینی نظام کا نقصان آپ کو نظر آ رہا ہے۔ بلاشبہ ہم نے پوری چیز حاصل نہیں کی ہے مگر کشمکش کے پہلے مرحلے میں ہم نے اتنا فائدہ ضرور حاصل کیا ہے کہ ریاست کو ایک قطعی لادینی ریاست بننے سے روک دیا' اور اسلام کی چند ایسی بنیادی باتیں منوا لیں جن پر آگے کام کیا جاسکتا ہے۔ ہم اس غلط فہمی میں نہیں ہیں کہ ہمارا مقصود حاصل ہوگیا ہے۔ ہم اس مقام پر ٹھہر جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ بلکہ جو کچھ ہم نے حاصل کیا ہے اسے مزید مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں اور اب ہم پیش قدمی کے لیے اس سے بہتر پوزیشن میں ہیں جو اس قریبی مقصد کے حاصل نہ ہونے کی صورت میں ہماری ہوتی۔

ضروری ہے کہ میں ان دونوں باتوں کو ... کھول کر بیان کردوں۔

ہم جس ملک اور جس آبادی میں بھی ایک قائم شدہ نظام کو تبدیل کرکے دوسرا نظام قائم کرنے کی کوشش کریں گے وہاں ایسا خلا ہم کو کبھی نہ ملے گا کہ ہم بس اطمینان سے "براہِ راست" اپنے مقصود کی طرف بڑھتے چلے جائیں۔ لامحالہ اس ملک کی کوئی تاریخ ہوگی۔ اس آبادی کی مجموعی طور پر اور اس کے مختلف عناصر کی انفرادی طور پر کچھ روایات ہوں گی۔ کوئی ذہنی اور اخلاقی اور نفسیاتی فضا بھی وہاں موجود ہوگی۔ ہماری طرح کچھ دوسرے دماغ اور دست و پا بھی وہاں پائے جاتے ہوں گے جو کسی اور طرح سوچنے والے اور کسی اور راستے کی طرف اس ملک اور اس آبادی کو لے چلنے کی سعی کرنے والے ہوں گے۔

ان مختلف عوامل میں سے کچھ ہمارے موافق ہوں گے تو کچھ ناموافق اور مزاحم بھی ہوں گے۔ اور قائم شدہ نظام کا کسی کم یا زیادہ مدت سے وہاں قائم ہونا خود اس بات کی دلیل ہوگا کہ یہ

عوامل ہماری موافقت میں کم اور اس کی موافقت میں زیادہ ہیں۔ علاوہ بریں یہ بات بالکل فطری اور عین متوقع ہے کہ ہمارے مقابلہ میں یہ نظام ضرور ان تمام عوامل سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا جو اس کے لیے ساز گار ہیں یا بن سکتے ہیں اور ایسے تمام عوامل کو ہمارے لیے ناموافق یا کم از کم غیر مفید بنانے کی بھی سعی کرے گا جنہیں وہ سمجھتا ہے کہ وہ ہمارے حق میں سازگار ہیں۔ اور وہ تمام دوسری تحریکیں بھی جو ہمارے مقصد کی مخالف ہیں یا تو قائم شدہ نظام کی حمایت کریں گی، یا پھر موجودالوقت عوامل کو حتی الامکان ہمارے خلاف استعمال کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گی۔

ان حالات میں نہ تو اس امر کا کوئی امکان ہے کہ ہم کہیں اور سے پوری تیاری کرکے آئیں اور یکایک اس نظام کو بدل ڈالیں جو ملک کے ماضی اور حال میں اپنی گہری جڑیں رکھتا ہے۔ نہ یہ ممکن ہے کہ اسی ماحول میں رہ کر کشمکش کیے بغیر کہیں الگ بیٹھے ہوئے اتنی تیاری کرلیں کہ میدان مقابلہ میں اترتے ہی سیدھے منزلِ مقصود پر پہنچ جائیں ۔ اور نہ اس بات ہی کا تصور کیا جاسکتا ہے کہ ہم اُس کشمکش میں سے گزرتے ہوئے کسی طرح "براہ راست" اپنے مقصود تک جا پہنچیں۔ ہمیں لامحالہ واقعات کی اس دنیا میں موافق عوامل سے مدد لیتے ہوئے اور مزاحم طاقتوں سے کشمکش کرتے ہوئے بتدریج اپنا راستہ نکالنا ہوگا۔ ہر قدم جس کے لیے گنجائش نکل آئے فوراً اور بروقت اٹھا دینا ہوگا۔ دوسرے قدم کی گنجائش پیدا کرنے کے لیے پورا زور لگانا پڑے گا، اور سمتِ مخالف کی دھکا پیل اگر ہمیں پیچھے دھکیلے تو اس بات کی کوشش کرنی ہوگی کہ پہلے قدم کی جگہ پاؤں تلے سے نہ نکل جائے۔

اس کشمکش کے دوران میں جتنی ضروری بات یہ ہے کہ ہمارا آخری اور اصلی مقصود ہماری نگاہوں سے اوجھل نہ ہو، اتنی ہی ضروری یہ بات بھی ہے کہ ہم اس کی سمت میں بڑھنے کے لیے ہر درمیانی قدم کو مقصدی اہمیت دیں، جو قدم رکھا جاچکا ہے اسے زیادہ سے زیادہ مضبوط بنائیں، آگے کے قدم کے لیے زیادہ سے زیادہ قوت فراہم کریں، اور جونہی کہ اس کے لیے جگہ پیدا ہو اس پر فوراً قبضہ کرلیں۔ آخری مقصود پر نگاہ جمانا اگر اس لیے ضروری ہے کہ ہمارا کوئی قدم غلط سمت میں نہ اٹھے، تو درمیان کے ہر قدم کو اس کے وقت پر قریبی مطمعِ نظر کی حیثیت دینا اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر پیش قدمی کا امکان ہی نہیں رہتا۔ جسے صرف تمنائیں بیان کرنے پر اکتفا کرنا نہ ہو بلکہ منزلِ مقصود کی طرف واقعی چلنا بھی ہو اسے تو ہر قدم جمانے اور دوسرا قدم اٹھانے کے لیے تمام ممکن الحصول موافق طاقتوں سے اس طرح کام لینا اور تمام موجود مزاحمتوں کو

ہٹانے کے لیے اس طرح لڑنا ہوگا کہ گویا اس وقت کرنے کا کام یہی ہے۔

اس معاملہ میں صرف نظریت کام نہیں دیتی بلکہ اس کے ساتھ عملی حکمت ناگزیر ہے۔ اس حکمت کو نظرانداز کردینے والا نظری آدمی طرح طرح کی باتیں کرسکتا ہے۔ کیونکہ وہ یا تو قافلے میں شامل ہی نہیں ہوتا' یا پھر قافلے کو لے کر چلنے کی ذمہ داری اس پر نہیں ہوتی۔ مگر جسے چلنا ہی نہ ہو بلکہ چلانا بھی ہو وہ ہر بات کو محض اس کے خیالی حسن کی بنیاد پر قبول نہیں کرسکتا۔ اسے تو عملی نقطۂ نظر سے تول کر دیکھنا ہوتا ہے کہ جن حالات میں وہ کام کر رہا ہے' جو قوت اس وقت اس کے پاس موجود ہے یا فراہم ہونی ممکن ہے اور جو مزاحمتیں راستے میں موجود ہیں ان سب کو دیکھتے ہوئے کونسی بات قابلِ قبول ہے اور کونسی نہیں' اور یہ کہ کس بات کو قبول کرنے کے نتائج کیا ہوں گے۔

نظری آدمی تو بے تکلف کسی مرحلے پر بھی کہہ سکتا ہے کہ ایک ایک قدم اٹھانے اور قدم قدم کی جگہ کے لیے کشمکش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ "براہِ راست" کیوں نہیں بڑھ جاتے۔ مگر کام کرنے والا یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ راستے کی مزاحم طاقتوں کے ہجوم میں سے آخر براہِ راست کیسے بڑھ جاؤں ؟ ان کے سر پر سے چھلانگ لگا کر جاؤں ؟ زمین کے نیچے سے سرنگ لگا کر جا پہنچوں ؟ یا کوئی تعویذ ایسا لاؤں کہ اسے دیکھتے ہی یہ سارا ہجوم چھٹ جائے اور میں اپنے قافلے کو لیے ہوئے سیدھا اپنی منزل کی طرف بڑھتا چلا جاؤں ؟

نظری آدمی اس کشمکش کے دوران میں کسی جگہ بھی ٹھہر جانے یا پیچھے ہٹ جانے کا بڑے اطمینان سے مشورہ دے سکتا ہے۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ ٹھہر کر یا پیچھے ہٹ کر تیاری کرو اور پھر اس شان سے آؤ کہ بس ایک ہی ہلّے میں سابق نظام ختم اور نیا نظام پورا کا پورا قائم ہوجائے۔ مگر کام کرنے والے کو ایسے مشورے قبول کرنے سے پہلے یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ مزاحم طاقتوں کی موجودگی میں کشمکش روک کر ٹھہر جانا ممکن بھی ہے یا نہیں ؟ پیچھے ہٹوں تو بیک وحلہ منزل پر پہنچنا تو درکنار اس جگہ واپس آنے کا بھی کوئی امکان باقی رہ جاتا ہے جہاں سے پلٹنے کے لیے کہا جا رہا ہے ؟ اور کیا میرے ٹھہرنے یا ہٹنے کی صورت میں مزاحم طاقتیں بھی ٹھہر یا ہٹ جائیں گی کہ وہ ماحول کو میرے لیے اور زیادہ ناسازگار بنانے سے رک جائیں اور میں اسے خوب سازگار بنا کر اور خود پوری طرح تیار ہو کر بڑے اطمینان سے ایک بھرپور حملہ کرسکوں ؟

غرض نظری آدمی کے لیے ہر قابلِ تصوّر تجویز لے آنا ممکن ہے کیونکہ جن تخیّلات کے عالم میں وہ رہتا ہے وہاں حالات اور واقعات موجود نہیں ہوتے صرف خیالات ہی خیالات ہوتے ہیں'

مگر کام کرنے والا واقعات کی دنیا میں کام کرتا ہے اور اس پر کام چلانے کی ذمّہ داری ہوتی ہے' اس لیے وہ عملی مسائل کو کسی حال میں نظرانداز نہیں کرسکتا۔

ایک اور حیثیت سے بھی نظریت اور حکمتِ عملی میں ٹھیک ٹھیک توازن قائم رکھنا اس شخص کے لیے ضروری ہے جو واقعات کی دنیا میں عملاً اپنے نصب العین تک پہنچنا چاہتا ہو۔ آئیڈیلزم کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اپنے نصب العین کی انتہائی منزل سے کم کسی چیز کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے' اور جن اصولوں کو وہ پیش کرتا ہے ان پر سختی کے ساتھ جما رہے۔ مگر واقعات کی دنیا میں یہ بات جوں کی توں کبھی نہیں چل سکتی۔ یہاں نصب العین تک پہنچنے کا انحصار ایک طرف ان ذرائع پر ہے جو کام کرنے والے کو بہم پہنچیں' دوسری طرف ان مواقع پر ہے جو اسے کام کرنے کے لیے حاصل ہوں۔ اور تیسری طرف موافق اور ناموافق حالات کے اس گھٹتے بڑھتے تناسب پر ہے جس سے مختلف مراحل میں اسے سابقہ پیش آئے۔ یہ تینوں چیزیں مشکل ہی سے کسی کو بالکل ساز گار مل سکتی ہیں ۔ کم از کم اہلِ حق کو تو یہ کبھی ساز گار نہیں ملی ہیں اور نہ آج ملنے کے کوئی آثار ہیں۔

اس صورتِ حال میں جو شخص یہ چاہے کہ پہلا قدم آخری منزل ہی پر رکھوں گا' اور پھر دورانِ سعی میں کسی مصلحت و ضرورت کی خاطر اپنے اصولوں میں کسی استثناء اور کسی لچک کی گنجائش بھی نہ رکھوں گا' وہ عملاً اس مقصد کے لیے کوئی کام نہیں کرسکتا۔ یہاں آئیڈیلزم کے ساتھ برابر کے تناسب سے حکمتِ عملی کا ملنا ضروری ہے۔ وہی یہ طے کرتی ہے کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے راستے کی کن چیزوں کو آگے کی پیش قدمی کا ذریعہ بنانا چاہیے' کن کن مواقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے' کن کن موانع کے ہٹانے کو مقصدی اہمیت دینی چاہیے اور اپنے اصولوں میں سے کن میں بے لچک ہونا اور کن میں اہم تر مصالح کی خاطر حسبِ ضرورت لچک کی گنجائش نکالنا چاہیے۔ (رسائل و مسائل' چہارم' ص ۳۰۵ - ۳۲۲)